بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سیاسی قائدین کے نام!

(سیرت محمدیہؐ ہمارے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین ماڈل) ہے)

شعور آدمیت ناز کر اس ذاتِ اقدس پر
تیری عظمت کا باعث ہے، محمد کا بشر ہونا (احمد ندیم قاسمی)

ملّتِ اسلامیہ کی یہ انتہائی سوختہ بختی ہے کہ اس نے اللہ، اس کے عطا کردہ ضابطۂ ہدایت اور اس کے لانے والے رسولؐ اعظم کی سیرت طیبہ کے درخشاں گوشوں کو پسِ پشت ڈال کر اپنے لئے اپنی مرضی کے دستور العمل بنانے شروع کر دیے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اللہ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کے سامنے پوری بنی نوعِ انسان کی منفعت ہوتی ہے جبکہ انسانوں کے بنائے ہوئے دستور ہائے حیات کے مرتبین (خواہ وہ کوئی ایک انسان ہو یا انسانوں کی کوئی جماعت) اپنے ذاتی مفادات سے بالا سوچ ہی نہیں سکتے، اس لئے ان کا مرتب کردہ دستورِ حیات منفعتِ عامہ کا ذریعہ بن ہی نہیں سکتا۔ اسی فرق کو علامہ اقبالؒ نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں یوں بیان فرمایا ہے۔

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سود خود بیند، نہ بیند سودِ غیر
وحی حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

مسلمانانِ ہند کی زندگی میں سب سے پہلی بار، سر سید احمد خانؒ نے یہ آواز بلند کی کہ ہماری نکبت و زبوں حالی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کی حاکمیت کو بھول چکے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی حاکمیت قائم کرنے کے لئے ملّت کے بطلِ جلیل حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں حصولِ پاکستان کی جنگ لڑی گئی اور مسلمانوں کی بے شمار قربانیوں اور قائدِ اعظمؒ کی بے مثال فراست کے تصدق 13/14 اگست 1947ء کی درمیانی شب (مطابق 27 رمضان المبارک 1363ھ)، مملکتِ خداداد پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھری۔ بانیٔ پاکستان کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس مملکت کو، وہ قرآنی دستور نہ مل سکا جس کا نفاذ اس کی وجہِ جواز تھا۔

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصور کا یہ دستور اگر قائداعظم کی زندگی ہی میں بن گیا ہوتا تو قوم اب تک نہ صرف اللہ کے عطا کردہ نظام ربوبیت کی فیوض و برکات سے بہرہ یاب ہو چکی ہوتی بلکہ اس دستور کے تحت قانون سازی کرتے وقت شارح قرآن کی سیرت طیبہ کا ایک ایک گوشہ قوم کے سامنے رہتا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ اس کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی۔

زہے قسمت کہ 10 اگست 1995ء کے دن' قومی سیرت کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر مملکت پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے من جملہ دیگر امور' نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ دعا بھی کی کہ **اللہ ہمیں اپنی زندگی کے ہر گوشے میں' اس سیرت طیبہ سے راہنمائی حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔**

ایسے ہی جذبات کا اظہار' صدر پاکستان' جناب فاروق احمد لغاری صاحب نے بھی اس کانفرنس کے دوران کیا۔ مملکت کے ان ہر دو اعلیٰ ترین مناصب پر فائز شخصیات کی جانب سے ان آرزوؤں کا اظہار ایسا خوش آئند اور روح افزا تھا کہ

جاں نذر کرنی بھول گیا اضطراب میں

اکابرین ملت کی ان آرزوؤں کے پیش نظر ہم ان حضرات کی خدمت میں اس داعئ انقلاب کی سیرت کا ایک گوشہ بطور خاص پیش کر کے ان سے عرض کریں گے کہ وہ آگے بڑھ کر اس بات کا عملی ثبوت دیں کہ سیرت کانفرنس میں ان کی اس دعا سے ان کا مقصد عوام سے فقط داد وصول کرنا نہ تھا بلکہ یہ دعا ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم قائد حزب اختلاف جناب محمد نواز شریف صاحب سے بھی توجہ چاہیں گے' کیونکہ سیرت طیبہ کے اس پہلو پر عمل پیرا ہونے سے' جہاں ہماری بے شمار بیماریوں کا علاج ہو سکے گا وہاں مستقبل میں ان مناصب پر آنے والے افراد کے لئے ایسے نشانات راہ چھوڑنے کی روائت قائم ہو جائیگی جن پر چل کر قوم مسرتوں اور کامرانیوں کے جھولے جھولتی' شاداں و فرحاں' جادۂ زندگی پر چل نکلے گی۔

اس سے پہلے کہ ہم حضور نبیؐ اکرمؐ کی سیرت طیبہ کا یہ درخشاں و تابندہ گوشہ سامنے لائیں جو ہمارا مدعا ہے' ہم محترم صدر مملکت' محترمہ وزیراعظم اور میدان سیاست کے دوسرے زعماء کی خدمت میں عربی زبان کا ایک ایسا کلاسک قول پیش کرنے کی اجازت چاہیں گے جسے اگر سامنے رکھا جائے تو کسی قسم کی کجروی کا احتمال ہی باقی نہ رہے۔ وہ قول ہے۔

لو دامت لغیرک ما اتصلت بک

اگر دوسرے لوگ اسے (کرسئ اقتدار کو) ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکتے تو یہ تم تک کبھی نہ پہنچ پاتی۔ یعنی یہ حقیقت کہ آج اس کرسی پر تم رونق افروز ہو' اس بات کا کھلا ہوا اور ناقابل تردید ثبوت ہے کہ تم سے

پہلے اس کرسی پر بیٹھنے والے اسے اپنے پاس نہ رکھ سکے۔ اور پھر اس کا بدیہی نتیجہ یہ کہ یہ کرسی' اپنی دائمی روش کے مطابق' ایک دن تم سے بھی چھٹکارا حاصل کر کے کسی اور کو راحت جلوس بہم پہنچائے گی (کہ اس سے بے وفا شائد ہی کوئی اور متاع حیات ہو)۔ اس لئے جب تک اس پر بیٹھے ہو' اگر ایسے کام کر جاؤ' جن میں ذاتی اور گروہی مفاد پرستیوں کی جگہ منفعت عامہ کا پہلو غالب رہے تو شائد یہ کرسی باقیوں کی نسبت زیادہ دیر تک تمہارا وجہ گوارا کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے کہ۔

أَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13/17)۔

اس جہاں میں بقا صرف اس کو ہے' جو تمام بنی نوع انسان کے لئے نفع بخش ہو؟

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ حضور نبیؐ اکرمؐ کی زندگی میں اہل مکہ نے آپ کو جن مشکلات سے دوچار کئے رکھا اور جس بے دردی سے وہ آپ کو اذیتیں دیتے رہے' آج بھی ان کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے' لیکن اسی مکہ میں جب آپؐ ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ خانہ کعبہ تشریف لے گئے۔ اسے بتوں سے پاک کیا اور اس کے اندر داخل ہو کر بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوئے۔

اس کے بعد آپ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ دربار حکومتِ الٰہیہ کا پہلا خطبہ تھا۔ حضورؐ نے بآواز بلند کہا۔

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی' باقی بتان آذری

صَدَقَ وَعْدَهُ نَصَرَ عَبْدَهُ هَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ

قابل ہزار حمد و ستائش اور در خور صد ہزار تشکر و امتنان ہے وہ بارگہ صمدیت' جس نے اپنے وعدوں کو پورا کیا جو اس وقت کئے گئے تھے جب (بظاہر) کامرانی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس نے اپنے بندے کی تائید و نصرت فرمائی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اے قوم قریش! جاہلیت کا غرور باطل' نسبت کا افتخار پندار آور' سب خدائے جلیل نے مٹا دیئے۔ یاد رکھو! نوع انسانی کی اصل ایک ہے اور اس کا سلسلہ تخلیق مٹی سے شروع ہوتا ہے۔ تمام مفاخر' تمام انتقامات اور سب خوں بہا آج میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ اب مساوات انسانی اور احترام آدمیت کا دور آگیا ہے۔ اب عزت و تکریم کا معیار' حسب نسب نہیں بلکہ جوہر ذاتی ہو گا۔

خطبہ کے بعد آپؐ نے مجمع پر نگاہ ڈالی تو ان میں وہ سب سر جھکائے کھڑے تھے' جنہوں نے اس داعی حق کی مخالفت میں اپنا سارا زور لگا دیا تھا اور آپ کی تضحیک و استہزا اور ایذا رسانیوں میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے شب ہجرت آپؐ کو قتل کرنے کی سازش کی تھی اور وہ بھی جو بدر کے میدان میں مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کو صفحہ ہستی سے مٹانے آئے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے حضورؐ کے چچا حمزہؓ

... اور حضورؐ کو زخمی کرنے کی ناپاک جسارت کی تھی۔ یہ سب مفتوح و مغلوب سامنے کھڑے تھے اور دوسری طرف فاتح و منصور اللہ کا رسولؐ جسے آج دنیا کا کوئی قانون' عدل کا کوئی تقاضا' ان مجرمین کو قرار واقعی سزا دینے سے نہ روک سکتا تھا۔ مگر اس مقام پر حضورؐ نے ان سب کو گذرا ہوا ایک ایک واقعہ یاد دلا کر پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔ یہ سب حیرت و استعجاب کے عالم میں اس رحمت للعالمین کی جانب دیکھ رہے تھے کہ حضور کی آواز بلند ہوئی۔

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاء

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔

حضورؐ کا یہ عفو عام وہ انقلاب آفریں طرز عمل تھا جس نے اسلام کو خالدؓ بن ولید جیسے جرنیل عطا کئے جنہوں نے شوکت و قوت اسلام کے زمانہ بھر میں جھنڈے گاڑ دیئے۔

آگے بڑھئے۔ سامنے دیکھئے۔ یہ عثمان بن طلحہ شیبی ہے جس کے پاس کعبہ کی کلید رہتی تھی۔ ہجرت کے وقت حضورؐ اس کے پاس آئے اور کہا کہ ذرا کعبہ کا دروازہ کھول دو تو میں اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو تسکین دے لوں۔ اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ آج کعبہ کی وہی کنجی آپ کے ہاتھ میں تھی اور وہی عثمان سامنے کھڑا تھا۔ سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ دیکھیں یہ کلید متاع دارین کسے عطا کی جاتی ہے۔ آپ آگے بڑھے اور یہ کنجی عثمان کے ہاتھ میں دے دی۔ یہ کنجی آج تک اسی عثمان کی اولاد میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ کیا اس ترحم خسروانہ۔ اور نوازش شہنشاہانہ کی نظیر کہیں اور مل سکتی ہے؟۔

یہ تھا حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کا وہ گوشہ جسے ہم آپ کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ تاریخ انسانیت کے اس زندہ و تابندہ واقعہ کو نگاہوں کے سامنے لائیے اور سوچیے کہ اس داعی حق کے نام لیوا' اس کی سیرت طیبہ پر فریفتہ ہونے کے دعویدار' ہم مسلمان کہاں کھڑے ہیں۔ پاکستان کی مختصر سی سیاسی زندگی میں کتنی حکومتیں زیر و زبر ہوئیں۔ کتنی بار انتخاب جیتنے والوں نے انتخاب ہارنے والوں کو اپنے غیض و غضب کا نشانہ بنایا۔ کتنی بار حزب اختلاف نے برسر اقتدار آکر وہی کچھ نہیں کیا جس کے وہ خود شکار رہے۔ انتقامی سیاست کا یہ دور دورہ کل بھی روا تھا' آج بھی رائج ہے۔ حزب اقتدار ہو یا حزب اختلاف۔ ان کی ساری توانائیاں باہمی منافرت و مناقشت پر خرچ ہو رہی ہیں یا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر۔ لب پہ دعا ہے کہ اللہ پاکستان کو اس کے دشمنوں سے بچائے۔ کس دشمن سے؟

ہوئے تم دوست جس کے' دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

محترم صدر مملکت اور واجب الاحترام وزیراعظم صاحبہ! آپ نے سیرت طیبہ سے راہنمائی حاصل کرنے کی سرعام آرزو کی ہے تو لیجئے ہم نے آپ کے سامنے حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کی ایک جھلک پیش کر دی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر بااقتدار اور بااختیار طبقے نے اپنے مفادات اور اپنی انا سے بلند ہو کر حضور کی سیرت

کے اس درخشاں پہلو پر غور کر لیا تو یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک یادگار موڑ ثابت ہو گا۔ اور اس کے برعکس اگر ہم نے سیرت طیبہ کے اس گوشے سے اب بھی کوئی سبق حاصل نہ کیا اور اپنی انفرادی' اجتماعی' سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک دوسرے سے بدلہ لینے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی لگن میں مگن رہے تو پھر ہمیں اس عذاب کے لئے تیار رہنا چاہئے جو اپنے اللہ اور رسولؐ سے نمائشی رشتے جوڑنے اور جھوٹے وعدے کرنے کے نتیجہ میں ہم پر وارد ہونے والا ہے۔

ہر چند کہ ہماری اپیل ملک کے تمام سیاسی زعماء سے ہے لیکن صدر مملکت اور وزیراعظم صاحبہ' حضور نبی اکرمؐ کی سیرت کے اس گوشے کو اپنانے میں پہل کرنے کی سعادت حاصل کر سکیں تو یہ ایک ایسی مثال ہو گی جو زمانے کی ریگ رواں اور تاریخ پاکستان کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھی جائیگی۔

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

مجبوریاں

جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے پاکستان میں محکمہ ڈاک' شرح ڈاک میں آئے دن اضافہ کرتا رہتا ہے جس کے لئے نہ وقت کی قید ہے نہ اس بات کا یقین کہ محکمے کے پاس نئی شرح کے مطابق ٹکٹ بھی دستیاب ہیں یا نہیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے پاکستان سے شائع ہونے والے اکثر جرائد وزن گھٹانے کے لئے جرائد کا حجم کم کرنے پر مجبور ہیں۔ موجودہ وزن کا قائم رکھنا اگرچہ ہمارے لئے بھی ممکن نہیں لیکن ہم نے فیصلہ کیا ہے ہم اپنے قارئین کو دیئے جانے والے علمی مواد کو علی حالہ قائم رکھتے ہوئے کتابت 15 پوائنٹ کی جگہ 13 اور سطریں 25 کی جگہ 31 کر کے موجودہ 2000 سطروں کا مواد 80 کی بجائے 64 صفحات پر محدود کر دیں گے۔ اس طرح پرچے کا تحریری حجم وہی رہیگا۔ وزن البتہ 25 سے 30 گرام کم ہو جائیگا اور کاغذ جس کا نرخ 185 سے بڑھ کر 335 روپے ہو چکا ہے' بھی قدرے کم خرچ ہو گا۔ ہمیں امید ہے قارئین اس تبدیلی کو بخوشی قبول فرما لیں گے۔

مدیر۔ طلوع اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

مدیر ہفت روزہ نظریہ پاکستان (لائل پور) کے سوالات کے جوابات

نوٹ :- جولائی 95ء کے شمارہ میں جناب حنیف رامے صاحب سے پرویز صاحب کا انٹرویو پڑھنے کے بعد قارئین نے مطالبہ کیا ہے کہ پرویز صاحب کے تمام انٹرویو تسلسل کے ساتھ دوبارہ شائع کئے جائیں- یہ سلسلہ آئندہ چھ ماہ تک جاری رہیگا- مدیر

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتہ سلطانی و ملائی و پیری

سوال نمبر1

کیا آئینہ ضمیری سے حضرت علامہؒ کی مراد قرآن کے آئینہ میں صورت نگری سے ہے اور کیا آج کے "کشتہ سلطانی و ملائی و پیری" مسلمان نے اپنے ذہن میں خدا کا تصور وہی نہیں جما لیا ہوا اور اللہ کو "خوش" کرنے کے وہی طور و طریقے نہیں اپنا رکھے جو شاہوں کے درباروں کے لئے مختص تھے- اور کیا "سلطانی و ملائی و پیری" ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو نہیں ہیں؟

جواب-

ایک مغربی مفکر (غالباً لاک) نے کہا ہے کہ تم مجھے کسی قوم کے متعلق اتنا بتا دو کہ اس نے اپنے لئے کس قسم کا معبود اختیار کر رکھا ہے تو میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن، معاشرت، سیاست وغیرہ کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا- یہ ہے معبود کے تصور کا قوموں کی زندگی سے تعلق- قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی جو صفات حسنہ بیان فرمائی ہیں ان کی رو سے خدا کا جو بلند و بالا تصور سامنے آتا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں- آپ کے سوال کی نسبت سے میں اس کی صرف ایک صفت "الحکیم" کا سامنے لانا کافی سمجھتا ہوں- "الحکیم" سے مراد ہے ایسا خدا جس کا ہر حکم ایک قانون ہے جو علم و حکمت پر مبنی ہے اور جسے عقل و بصیرت کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے- اس نے اپنے ہر قانون کی غرض و غایت (حکمت) بتا دی ہے-

اور اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ وہ حکم (قانون) کیوں دیا جا رہا ہے- اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کیا ہو گا اور اس کی خلاف ورزی کا انجام کیا- ان قوانین میں نہ کوئی دھاندلی ہے نہ آمریت- نہ کسی کے خلاف انتقامی کاروائی، نہ کسی کی رُو رعایت- یہ قوانین غیر متبدل بھی ہیں اور عالمگیر بھی- اس نے اسی جہت سے ان قوانین پر مشتمل اپنی کتاب (قرآن مجید) کو بھی "الحکیم" کہا ہے اور واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا کی حکمرانی سے مراد اس کی کتاب کی حکمرانی ہے- یعنی قانون کی حکمرانی- یہ تھا خدا کا وہ تصور جسے قرآن کریم نے پیش کیا لیکن اس کے بعد ہمارے دور ملوکیت میں ایک "نئے خدا" کا تصور وضع کیا گیا جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ تھا نہ قانون- نہ ضابطہ تھا نہ دستور- وہ خالصتہً "شخصی حکمران" یا آمر مطلق تھا- جو جی میں آئے کرتا اور جس قسم کا چاہے حکم دے دیتا تھا- اس کی کیفیت (سعدی کے الفاظ میں) یہ تھی کہ "گاہے بہ سلامے بر بخشد و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشد"---- کبھی سلام کرنے سے ناراض ہو گئے تو گاؤں کے گاؤں پر گدھوں کے ہل چلوا دیئے اور کبھی گالی دینے پر خوش ہو گئے تو جاگیر بخش دی---- اور یا (پنجابی شاعر) راقب کے الفاظ میں ایسا کہ :

اوتھے کیہہ پرواہ ہے راقب، اوتھے بے پرواہیاں
پھڑ لئے عملاں والیاں نوں، چھڈ دے او گنہار نوں

"اے راقب، خدا بڑا بے پرواہ ہے- وہ چاہے تو نیک اعمال والوں کو پکڑ لے اور چاہے گنہگار کو چھوڑ دے"

ہمارے دور ملوکیت میں اس قسم کا خدا کا تصور وضع کیا گیا اور اس کے بعد کہا کہ "السلطان ظل اللہ علی الارض"۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ خدا کا اس قسم کا تصور ہمارے ہاں آج تک چلا آ رہا ہے۔ یہ ہے وہ "سلطانی" جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ استبداد ملوکیت کا اندازہ قرآن کریم میں بیان کردہ اس واقعہ سے لگائے جس میں کہا گیا ہے کہ جب ساحرین دربار فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی پیش فرمودہ صداقت کو اپنے سامنے دیکھ لیا اور اس طرح اس پر علی وجہ البصیرت ایمان لے آئے' تو فرعون گرج کر بولا۔ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (7/123)۔ تم میرے حکم اور اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو" اب دیکھو میں اس کی تمہیں کیا سزا دیتا ہوں۔ یعنی' اس نے یہ نہیں کہا کہ تم جس بات پر ایمان لے آئے ہو' وہ یوں غلط ہے۔ اس نے کہا یہ کہ تم نے میری اجازت کے بغیر ایسا کیوں کیا ہے؟ یہ ہے استبداد سلطانی جس کی رو سے کوئی شخص اپنی سوچ' فکر' بصیرت کی رو سے خود اپنے متعلق بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ہر فیصلہ کے لئے بارگاہ سلطانی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

2- لیکن اس قسم کی مستبد آمریت' مذہبی پیشواؤں کی تائید کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اس مقصد کے لئے تخت و تاج اور محراب و منبر میں ایک سمجھوتا ہوا جس کی رو سے امور مملکت' سلطان کی تحویل میں دے دیئے گئے اور معاملات شریعت' ارباب مذہب کے قبضے میں۔ اس طرح انسانی زندگی کے ہر دو دوائر میں استبداد کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ سلطان نے ارباب مذہب کی حکمرانی کا تحفظ کیا اور ارباب مذہب نے بادشاہوں کی تائید و نصرت کے لئے اپنے خطبوں میں دعائیں مانگیں۔ امت ان کے استبداد کے نیچے پستی رہی۔

ان کے استبداد کی صورت یہ ہے کہ۔ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (2/79)۔ یہ اپنی فیصلوں کو احکام خداوندی کہہ کر لوگوں سے منواتے ہیں۔

3- اس کے بعد ایک تیسرا گروہ آگے بڑھا۔ اس نے کہا کہ سلطان کا تعلق امور مملکت سے ہے اور مذہبی پیشواؤں کا واسطہ ظواہر سے۔ لیکن انسان کی حقیقی زندگی اس کے "باطن" کی زندگی ہے۔ اصلی مقصود اس زندگی کی تطہیر و تزکیہ ہے جو صرف مُرشد کی اطاعت سے ممکن ہے۔ اسے تصوف یا مسلک خانقاہیت کہا جاتا ہے۔ اس مسلک کی بنیادی شرط یہ ہے کہ

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر ہنوز از راہ و رسم منزلہا

یعنی مرشد کی اطاعت۔ بے غل و غش اطاعت۔ بلا چون و چرا اطاعت۔ بغیر سوچے سمجھے اطاعت' ایسی اطاعت کہ اس کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی خیال نہ ابھرنے پائے۔ یہ استبداد کی تیسری اور شدید ترین شکل تھی۔

ہماری ساری تاریخ (صدر اول کے بعد) اسی استبداد ثلاثہ کی داستان خونچکاں ہے اور یہ امت "دکشتہ سلطانی و ملائی و پیری"

4- قرآن کریم انسانی فکر کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور آسمانی راہنمائی کا ایک بنیادی مقصد اس کی فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنا ہے۔ سورہ تغابن میں ہے۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ یہاں جو واقعہ بھی ظہور میں آتا ہے۔ قانون خداوندی کے مطابق آتا ہے۔ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (64/11)۔ جو شخص ان قوانین کی صداقت پر علی وجہ البصیرت یقین رکھتا ہے اس کی قوت فکر (قلب) کو ایسی راہ نمائی مل جاتی ہے جس سے وہ ان قوانین کی غرض و غایت کو بھی سمجھ لیتا ہے اور ہواؤں کے رخ سے آنے والے طوفانوں (حوادث) کا بھی اندازہ کر لیتا ہے۔ جس قوم کو اس قسم کی فکری صلاحیت نصیب ہو جائے وہ یقیناً امامت امم (قوموں کی لیڈر شپ) کی اہل قرار پا سکتی ہے۔ اس قسم کی فکری جلا کو فراست مومنانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور حضرت علامہؒ نے (اپنے زیر نظر شعر میں) اسے مومن کی

"آئینہ ضمیری" کہہ کر پکارا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی آئینہ ضمیری، حریت فکر و نظر ہی سے میسر آسکتی ہے لیکن جس قوم کی فکری صلاحیتوں کو صدیوں کے استبداد سلطانی و ملائی و پیری نے مفلوج بلکہ مصلوب کر دیا ہو، اسے یہ آئینہ ضمیری کہاں سے ملے گا۔ ایسی قوم کی تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (7/ 179)۔ وہ دل و دماغ تو رکھتی ہے لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتی۔ آنکھیں رکھتی ہے لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتی۔ کان رکھتی ہے لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتی۔ یہ قوم جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق حضرت علامہ کے اس شعر کا مفہوم قرآن کریم اور تاریخ کی روشنی میں ـــــ اور یہ ہے وہ انداز جس کے مطابق میں فکر و پیامِ اقبال کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال نمبر 2

علامہ اقبال نے اپنی نظم میں ارشاد فرمایا ہے۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

آپ یہی کچھ نثر میں لکھتے چلے آرہے ہیں۔ مسلمان انہیں تو عاشق رسولؐ اور رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں اور عجمی سازش کو بے نقاب کرنے پر آپ سے ناراض و برہم ہیں۔ یہ تضاد کیوں ہے؟

جواب

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں شاعر کو (Seriously) لیا ہی نہیں جاتا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے محض تصوراتی دنیا کے خواب اور تفننِ طبع کا ذریعہ سمجھا اس قسم کے فقرے آپ نے اکثر سنے ہوں گے کہ "یار! اسے چھوڑو۔ وہ محض شاعری کرتا ہے" اس سے یہی مراد ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر جو کچھ رند و زاہد اور دوسری طرف "شاہد و شمع و شراب و سرود کے متعلق صدیوں سے کہتے چلے آرہے ہیں اور لوگ اسے مزے لے لے کر سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں، وہ ان میں سے کوئی ایک بات نثر میں کہیں اور پھر دیکھیں کہ ان کا حشر کیا ہوتا ہے؟ علامہ اقبال کو بھی اس کا احساس تھا کہ شاعر کو لوگ (Seriously) نہیں لیتے۔ اس لئے وہ بار بار کہتے تھے کہ نہ میں شاعر ہوں، نہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس سے شاعری مقصود ہے۔ لیکن ان کی اس تنبیہہ سے کیا ہوتا ہے۔ لوگوں نے انہیں شاعر ہی سمجھا اور ان کے پیغام کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاعری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ حضرت علامہ قرآنی فکر کے متعلق جو کتاب (نثر میں) لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اگر وہ کتاب مرتب ہو جاتی تو اس سے اسلام اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں دنیا کے سامنے آ جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور قوم ایک عظیم متاع سے محروم رہ گئی۔

میں (اپنی بصیرت کے مطابق) قرآنی فکر کو نثر میں پیش کرتا ہوں اور لگی لپٹی بغیر پیش کرتا ہوں۔ اس لئے تمدن، تصوف، شریعت، کلام۔ غرضیکہ ہر گوشے سے اس کی مخالفت ہوتی ہے اور سخت مخالفت۔

اس مخالفت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت، پاکستان میں تھیاکریسی، مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اور میں شروع دن سے اس کی مخالفت کرتا چلا آرہا ہوں۔ میں ایک بے سروساماں اور بے ساز و یراق انسان ہوں لیکن قرآن کی آواز اپنے اندر ایسی قوت رکھتی ہے (کیونکہ وہ دلائل و براہین پر مبنی ہوتی ہے اور سوچنے والے ذہنوں سے چپک جاتی ہے) کہ یہ حضرات اس سے خائف رہتے ہیں اور میرے خلاف طرح طرح کے الزامات تراش کر کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کی یہ آواز عام نہ ہونے پائے۔ اگر حضرت علامہ زندہ رہتے اور مملکت پاکستان کے آئین و ضوابط کی تدوین اور اسلامی نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں وہی کچھ کہتے جو میں کہہ رہا ہوں

تو آپ دیکھتے کہ ان کی بھی کس طرح مخالفت ہوتی ! (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے خلاف ان کے ایک بیان پر جس طرح بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا تھا' اس کے تو آپ بھی عینی شاہد ہوں گے۔

سوال نمبر3

یہ تو آپ کی نظروں سے یقیناً گزرا ہو گا کہ مودودی صاحب نے احادیث کو فرسودہ ذخیرہ تک کہا ہے اور آپ سے کہیں زیادہ سخت الفاظ اس ضمن میں تحریر کئے ہیں۔ آپ کے نزدیک فرموداتِ رسولؐ ضعیف' موضوع اور وضعی ہو ہی نہیں سکتے اور آپ ایسی روایات کو حدیثِ رسولؐ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ حیرت ہے کہ جہانِ ملّا میں آپ کو منکر حدیث کہا جاتا ہے۔ کیا مودودی صاحب کی ایسی تحریروں پر مولوی صاحبان کی نگاہ نہیں پڑتی؟

جواب۔

حدیث کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ احادیث کے متداول مجموعوں میں صحیح اور وضعی ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ ان میں جو روایات قرآن کریم کے احکام اور تعلیم کے خلاف ہوں یا جن سے حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس واعظم کے خلاف کوئی طعن پڑتا ہو یا جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو' ان کے متعلق میں کہتا ہوں کہ وہ وضعی ہیں۔ وہ رسولؐ اللہ کی حدیثیں ہو نہیں سکتیں۔ میں ایسی حدیثوں کو صحیح ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ یہ ہے میرا "انکار حدیث" جس کے متعلق طرح طرح کے افسانے تراشے جاتے ہیں جہاں تک مودودی صاحب کا تعلق ہے' اتنا ہی نہیں کہ وہ احادیثؐ کے متعلق سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کا مسلک مرزا غلام احمد قادیانی کے مسلک سے ملتا جلتا ہے۔ مرزا صاحب کا مسلک یہ تھا کہ

جو شخص خدا سے حکم ہو کر آیا ہے' اسے اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے' خدا سے علم پا کر قبول کر لے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے۔ (تحفہ گولڑویہ ص 10).

چنانچہ اس مسلک کے مطابق مرزا صاحب اپنے مطلب کی حدیثوں کو صحیح قرار دیکر بطور سند پیش کر دیتے اور جو حدیثیں ان کے مطلب و مقصد کے خلاف جاتیں انہیں مسترد کر دیتے تھے۔ یعنی احادیث کے رد و قبول کا معیار ان کا اپنا فیصلہ تھا۔

مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ :

"جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین نبوت کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنت نبویہ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح' روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی بصیرت' بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام

کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب ضعیف' منقطع السند و مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل' غیر شاذ' متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوتی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات حصہ اول ص 324, 323)"

اس معیار کے مطابق مودودی صاحب بھی جس حدیث کو مفید مطلب پاتے ہیں اسے صحیح قرار دیتے ہیں جسے اپنے مطلب اور مقصد کے خلاف دیکھتے ہیں اسے رد کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مزاج شناس رسولؐ کو (جو انؐ کے متبعین کے نزدیک خود مودودی صاحب ہیں) اس کا بھی اختیار دیتے ہیں کہ جہاں کوئی حدیث نہ ملے وہ یہ کہدے کہ اگر آج رسولؐ اللہ موجود ہوتے تو آپ یہ فیصلہ دیتے' آپؐ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کس مقام سے بول رہے ہیں؟ شروع شروع میں مودودی صاحب کے اس قسم کے خیالات کی بنا پر مولوی صاحبان نے انہیں منکر حدیث بھی قرار دیا اور ان کے خلاف کفر کے فتوے بھی لگائے' لیکن اس کے بعد جب ان کے (مودودی صاحب) کے ہاں زر و سیم کے چشمے ابل پڑے اور ان کے پراپیگنڈے کی مشینری منظم اور مستحکم ہو گئی تو ان حضرات نے اپنے ہونٹ سی لئے۔ میرے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں اس لئے میرے خلاف جو ان کے جی میں آئے' کہتے چلے جاتے ہیں۔ (اس کی بنیادی وجہ سوال نمبر 2 کے جواب میں عرض کر چکا ہوں)۔

سوال نمبر 4

طلوع اسلام میں "شاہد عادل" نے مودودی صاحب کی تفہیم القرآن پر جو تنقید و جرح کی ہے۔ کیا آپ اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو مودودی صاحب کی قرآن فہمی اور دین شناسی کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

جواب۔

"طلوع اسلام" میں "شاہد عادل" کے قلم سے مودودی صاحب کی تفسیر پر جو تفصیلی تنقید شائع ہوئی ہے' علمی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا ہے اور یہ تقاضے دیگر گوشوں کی طرف سے بھی موصول ہو رہے ہیں کہ اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ یہ تجویز ادارۂ طلوع اسلام کے زیر غور ہے۔ لیکن اس تفسیر پر تنقید تو اس موضوع کا صرف ایک گوشہ ہے۔ مودودی صاحب نے جس بُری طرح سے اسلام کو مسخ کیا ہے' اس کی نقاب کشائی کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جس طرح 'براہین احمدیہ' کی اشاعت کے وقت مسلمان مرزا غلام احمد سے دھوکا کھا گئے تھے۔ اسی طرح وہ مودودی صاحب سے بھی دھوکا کھا رہے ہیں۔ جب ان کا پراپیگنڈہ ختم ہوا اور ایسی فضا پیدا ہو گئی جس میں مسلمانوں نے ان کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچنا شروع کیا تو انہیں نظر آئیگا کہ یہ صاحب مرزا صاحب سے بھی زیادہ اسلام کو نقصان پہنچا گئے ہیں۔۔۔۔ طلوع اسلام میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی خطرہ کی نشاندہی کے لئے ہے۔

سوال نمبر 5

کیا کسی فرقہ کی اکثریت کو معیار حق و صداقت ٹھہرا کر نظام اسلام' اس کی فقہ کے مطابق اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آج ایک فرقہ کی اکثریت ہے تو امکان یہ بھی ہو سکتا ہے کل دوسرے فقہ کی اکثریت ہو جائے پرسوں اترسوں تیسرے کی۔ کیا کثرت و قلت کے معیار کو قرآن حق ماننے کے لئے تیار ہے۔ یا اسلامی نظام کے لئے حق و باطل کا معیار میزان خداوندی (قرآن) ہے۔

جواب۔

قرآن کریم کی رُو سے حق' حق ہوتا ہے خواہ اس کی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے اور باطل' باطل خواہ اس کے حق میں ساری دنیا ہو۔ جب نبی اکرمؐ نے پہلی مرتبہ حق کی آواز بلند کی اور فرمایا کہ (انا) اول المسلمین (39/12)۔ تو یہ حق کی آواز تھی حالانکہ اس وقت (دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق) اس آواز کا (Second) کرنے والا بھی ہنوز کوئی نہ تھا اور اکثریت ہی نہیں بلکہ) ساری دنیا اس کے خلاف تھی۔ اکثریت کو معیار حق و باطل قرار دینا' مغربی نظام جمہوریت کا وضع کردہ تصور ہے جو یکسر باطل اور اسلام کی نقیض ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے معیار حق و باطل۔ خدا کی کتاب ہے اور کفر و ایمان میں خط امتیاز۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (5/44)

جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے' وہی کافر ہیں۔

میں نے اس موضوع پر اپنے اس خطاب میں جسے میں یومِ آزادی (1973ء) کی تقریب پر پیش کیا ہے' تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ خطاب __ کیا ہم آزاد ہیں--- پمفلٹ کی شکل میں دستیاب ہے۔ اسے ملاحظہ فرمالیجئے۔ ... میں ہمارے ہاں کے مختلف فقہی فیصلوں کو (خواہ کسی فرقہ سے متعلق ہوں) قرآنی کسوٹی پر پرکھ لینا چاہئے۔ جو اصولاً اس کے مطابق اور جزئی طور پر دورِ حاضر میں قابلِ عمل ہوں۔ انہیں اختیار کر لینا چاہئے۔ جو اس کے خلاف ہوں' انہیں مسترد کر دینا چاہئے۔ اسلامی نظام میں فقہ کی تدوین کا کام مسلسل جاری رہتا ہے اور اصول اس کا وہی ہے جس کی طرف میں نے اُوپر اشارہ کیا ہے۔

سوال نمبر6

آپ نے قرآن کے نظامِ ربوبیت کو صاف و شفاف انداز میں آمیزش کے کیچڑ سے نکال کر اچھی صورت میں مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ سوشلزم' کیمونزم کی طرف تو لپک رہے ہیں' ان میں اسے قبول اور برپا کرنے کے رجحانات کیوں نہیں پائے جاتے؟

جواب۔

میں قرآن کے صرف معاشی نظام کو پیش نہیں کرتا' اسے بحیثیت ایک کلّی ضابطۂ حیات کے پیش کرتا ہوں جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے' معاشی نظام اس کا صرف ایک گوشہ ہے۔ قرآنی نظام کو یا تو بالکلیہ تسلیم اور اختیار کرنا ہوتا ہے یا بالکلیہ چھوڑ دینا۔ وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے کسی ایک گوشے کو اختیار کر لیا جائے اور دوسرے گوشوں کو چھوڑ دیا جائے۔ جب اسے بحیثیت کلی نظام اختیار کیا جائے تو وہ انسانی سیرت و کردار کی حدود بندی کرتا ہے اور انہیں اقدار خداوندی کا پابند قرار دیتا ہے۔ ان حضرات پر یہ پابندیاں گراں گذرتی ہیں۔ اس کے برعکس سوشلزم یا کیمونزم کسی غیر متبدل ابدی ضابطہ اخلاق واقدار کے قائل ہی نہیں اس لئے وہ اپنے متبعین سے کسی قسم کی اخلاقی پابندی کا تقاضا ہی نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ "کھلی چھٹی" جس کی وجہ سے یہ حضرات سوشلزم اور کیمونزم کو ترجیح دیتے ہیں ورنہ جہاں تک خالص معاشی نظام کا تعلق ہے' قرآنی نظام سوشلزم یا کیمونزم کے نظام سے بھی کہیں آگے جاتا ہے۔

سوال نمبر7

کیا ایک مسلمان کیمونسٹ اور ایک کیمونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے؟

جواب۔

کیمونزم ایک معاشی نظام ہی نہیں' ایک نظریۂ زندگی ہے جس کی رُو سے' خدا' وحی' رسالت' آخرت' مستقل اقدار' سب سے انکار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ اس نظریۂ زندگی کا ماننے والا مسلمان ہو سکتا ہے' نہ کوئی مسلمان اس نظریہ کو ماننے کے بعد مسلمان رہ سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے کہ قرآن کریم

رو سے نہ کوئی کیمونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے' نہ کوئی مسلمان کیمونسٹ۔ لیکن اس باب میں ایک خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے اکثر نوجوان' محض انقلابی بننے کے چاؤ میں اپنے آپ کو کیمونسٹ یا سوشلسٹ کہنے لگ جاتے ہیں' حالانکہ انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کیمونزم یا سوشلزم کا فلسفۂ زندگی کیا ہے۔ ایسے نوجوانوں کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس امر کا یقین کر لینا ضروری ہو گا کہ ایمانیات کے متعلق ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یونہی مولوی صاحبان کی طرح فتویٰ صادر نہیں کر دینا ہو گا۔

سوال نمبر8

آپ کے نزدیک "روحانیت" سے کیا مراد ہے؟

جواب۔

"روحانیت" تصوف کی اصطلاح ہے اور تصوف' علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے" قرآن اور حدیث' بلکہ صدر اول کے لٹریچر میں اس کا نشان تک نہیں ملتا۔ بعد میں جب اسلام کی گاڑی دوسری پٹری پر جا پڑی تو مسلمانوں نے اس قسم کے تصورات غیروں سے مستعار لیکر انہیں اپنے مذہب کا جزو بنا لیا۔ دین کا مقصود۔ انفرادی طور پر سیرت و کردار کی پاکیزگی اور بلندی اور اجتماعی طور پر اقدار و قوانین خداوندی پر مبنی نظام کا قیام ہے۔ قرآن کریم نے 'اور تو اور' خود ذات رسالت مآبؐ کے متعلق بھی کسی "مقام روحانیت" کا ذکر نہیں کیا۔ آپؐ کے متعلق یہی ارشاد فرمایا کہ۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (68[illegible]) "یہ حقیقت ہے کہ آپ انسانی اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں"۔ قرآن مجید نے "رہبانیت" کے متعلق [illegible] میں کہا تھا کہ یہ انسانوں کا خود وضع کردہ مسلک ہے' خدا کا تجویز فرمودہ نہیں۔ ہم نے "رہبانیت" کا نام بدل کر "تصوف" رکھ لیا۔ اور اسے دین ہی نہیں "مغز دین" [illegible] دیا۔ اور اس طرح دین کا تصور اجتماعیت ختم کر کے اسے ذاتی اور انفرادی نجات کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ یہ اسلام کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی۔ اس کے لئے (زیادہ نہیں تو) کم از کم ارمغان حجاز میں وہ نظم دیکھئے جس کا عنوان ہے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اور جو میرے نزدیک حضرت علامہ کے فکر و پیغام کا ماحصل ہے اس میں ابلیس اپنے مشیروں کو ہدایت کرتا ہے کہ مسلمان کو بدستور مُصلائے رکھنے کا طریق یہ ہے کہ:

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے!
تابساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام!
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات

اس مقصد کے لئے نسخہ یہ ہے کہ:

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے!
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

اسی کو "روحانیت" کہا جاتا ہے اور (آپ کو شائد علم نہ ہو) راقم الحروف یہ منازل خود طے کر چکا ہے۔ اس لئے "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید"۔

سوال نمبر9

کیا حضور اقدس و اعظمؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے مراد زندگی کا وہ نمونہ ماڈل ہے جس کو تمام مسلمان اختیار کر سکتے ہیں یا کچھ اور ہے؟

جواب۔

ہاں! حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے یہی مراد ہے۔ حضورؐ کا وہ خُلقِ عظیم' جس کی طرف میں نے سوال نمبر8 کے جواب میں اشارہ کیا ہے' حضورؐ کی سیرت ہے اور جو شرف و مجد انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ حضورؐ کی یہ سیرت' مسلمانوں ہی کے لئے نہیں' تمام نوع انسان کے لئے قیامت تک بہترین' بلند ترین' حسین ترین' مکمل ترین' اور عدیم النظیر ماڈل ہے۔ بالفاظ دیگر' یوں کہئے کہ جسے قرآن نے صبغۃ اللہ (خدا کا رنگ) کہا ہے۔ اس کا محسوس مظہر'

سیرت محمدیہؐ کا اتباع مقصود انسانیت۔

سوال نمبر10

حضرت علامہؒ نے اپنے آخری بیان کے آخری پیرا گراف میں جو کہا تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ہم خیالوں (وطنی نظریہ کے حاملین) اور قادیانیوں دونوں نے حضورؐ کی کامل سیاست سے انکار کیا ہے اور دونوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ آپ حضرت علامہؒ کے اس فرمان کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب۔

حضرت علامہ نے اپنی اس بیان میں ایک عظیم حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ آپ نے کہا یہ ہے کہ دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن اس دین کی اقامت کے لئے امت کی تشکیل اسی رسول پر ایمان اور اس کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ملتا ہے۔ اس جہت سے مسلمان دین خداوندی کے متبع اور امت محمدیہؐ کے افراد ہیں۔ اگر کوئی شخص، نبی اکرمؐ کے بعد کسی اور نبوت پر ایمان لے آئے تو وہ امت محمدیہؐ کا فرد نہیں رہتا۔ اس نئے نبی کی امت کا فرد بن جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اسلام میں معیار قومیت، ختم نبوت پر ایمان کا اشتراک ہے۔

لیکن ہمارے زمانے میں ختم نبوت کی مہر ہی نہیں ٹوٹی، یہ نظریہ بھی وضع اور اختیار کیا گیا۔ کہ معیار قومیت، اشتراک وطنیت ہے، اس نظریہ کا عملی نتیجہ بھی وہی ہے جو ختم نبوت کے انکار کا ہے دونوں میں، معیار قومیت، ختم نبوت نہیں رہتا، کچھ اور قرار پا جاتا ہے۔

اور اب تو ہمارے ہاں (خیر سے) معیار قومیت، اشتراک وطن ہی نہیں، نسل، زبان بلکہ صوبائی اشتراک کو بھی معیار قومیت بتایا جا رہا ہے۔

خدا ایں سخت جاں را یار باوا
کہ افتاد اس از بام بلند مے

امت محمدیہؐ کا امت واحدہ ہونا لازمی ہے کیونکہ اس میں معیار قومیت ایک ہوتا ہے۔ لیکن جب معیار قومیت مختلف اور متعدد ہوں گے تو امتیں (قومیں) بھی الگ الگ اور متعدد ہو جائیں گی۔۔۔۔ خواہ یہ مختلف "نبیوں" کی طرف نسبت سے ہو اور خواہ مختلف وطنوں، نسلوں، زبانوں کی نسبت سے۔ یوں انکار ختم نبوت اور نیشنلزم (وطنیت) کا عملی نتیجہ یکساں ہو جاتا ہے۔

سوال نمبر11

کیا طلوع اسلام کا اجراء پہلے 1935ء میں (علامہؒ کی خواہش پر) جناب سید نذیر نیازی نے کیا تھا۔ اور 1938ء میں حضرت علامہ نے آپ کی اہلیت و قابلیت اور صلاحیت کو بھانپ کر اس کی ادارت جناب کے سپرد کی تھی اور اسے جاری کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی ترتیب دی تھی۔ جس کے دو ممبر راجہ حسن اختر مرحوم اور مودودی صاحب بھی تھے؟

جواب۔

طلوع اسلام (دور اول) حبیب مکرم نذیر نیازی صاحب نے دہلی سے جاری فرمایا جس کا پہلا پرچہ اکتوبر 1935ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا پرچہ فروری 1936ء میں شائع کرنے کے بعد نیازی صاحب لاہور منتقل ہو گئے۔ جہاں سے انہوں نے تین پرچے شائع کئے۔ آخری پرچہ مئی 1937ء کا تھا جس کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ علامہ اقبالؒ اس کے احیاء کے لئے متردد تھے اور نذیر نیازی صاحب اس کے لئے کوشاں، لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اسکا ذکر انہوں نے اپنی "ڈائری" میں کیا ہے جو حال ہی میں "اقبال کے حضور" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں کسی ایسی کمیٹی کا ذکر نہیں۔ جو راجہ حسن اختر (مرحوم) اور مودودی صاحب پر مشتمل تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے مودودی صاحب کا اس سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں حلقۂ اقبال میں چنداں اہمیت حاصل نہیں تھی۔ نیازی صاحب کی یہ ڈائری بڑے سائز کے قریب پانچ سو صفحات پر

پھیلی ہوئی ہے اور اس میں حضرت علامہ کے معمولات سے متعلق (1938ء کے ابتدائی تین ماہ کے) کوائف و حوادث بڑی تفصیل سے درج ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعہ تک اور قریب ہر اس شخص کے متعلق جو اس دوران میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن آپ یہ جان کر متعجب ہونگے کہ اس ضخیم اور مفصل ڈائری میں مودودی صاحب کا نام صرف ایک جگہ آتا ہے اور وہ بھی حضرت علامہ کی نسبت سے نہیں۔ اس میں ایک جگہ آقائے مرتضیٰ احمد خاں میکش (مرحوم) کا ذکر آگیا ہے اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے جماعت احمدیہ کے خلاف بکثرت مضامین لکھے اور مودودی صاحب سے بھی سلسلہ نزاع جاری رکھا' (ص 222) مودودی صاحب کا اور کہیں کسی سلسلہ میں نام تک نہیں آیا' حالانکہ یہ وہی زمانہ تھا جب یہ حیدر آباد (دکن) سے منتقل ہو کر دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ بنا بریں میں نہیں سمجھتا کہ نیازی صاحب کے طلوع اسلام سے متعلق کسی کمیٹی میں (اگر کوئی ایسی کمیٹی وجود میں آئی بھی تھی تو) مودودی صاحب شامل تھے۔

جب نیازی صاحب والا طلوع اسلام دوبارہ جاری نہ ہو سکا تو اپریل 1938ء میں' حضرت علامہ کی آرزو اور ان کے مشن کی تکمیل کے لئے موجودہ طلوع اسلام' دہلی سے' آزادانہ جاری کیا گیا۔ اس کے لئے کوئی کمیٹی نہیں بنائی گئی تھی۔

سوال نمبر 12

کیا ان اندوہناک لمحات اور خوفناک و خطرناک حالات میں ملت پاک کے بچاؤ کی کوئی تدبیر آپ کے ذہن میں ہے؟ کیا اس کی باز آفرینی کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ اگر ہو سکتی ہے تو عملی پروگرام کیا ہو سکتا ہے؟

جواب۔

اس کی باز آفرینی کی صورت تو ہو سکتی ہے لیکن قوم کی حالت یہ ہے کہ یہ آغاز کار "عملی پروگرام" سے کرنا چاہتی ہے اور قرآن حکیم ابتداً فکری پروگرام سے کرتا ہے۔ وہ فکری یا نفسیاتی تبدیلی کے بغیر عملی پروگرام کا تقاضا کرنے والوں سے برملا کہتا ہے کہ یہ طریق کار یکسر غلط ہے۔ یاد رکھو! اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (23/11)۔ اس آیہ جلیلہ کے الفاظ پر غور کیجئے۔ یوں تو خدا کی ہر بات حتمی اور یقینی ہوتی ہے لیکن جس بات پر اس نے زور دینا ہوتا ہے اسے (ہمیں سمجھانے کی خاطر) حتمی الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس آیت میں اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو۔ گوش ہوش سے سن لو۔ یہ یقینی اور حتمی بات ہے۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ کرے' خدا اس قوم کی حالت کو ہرگز ہرگز نہیں بدلتا۔ اگر ہمارا قرآن پر فی الواقعہ ایمان ہوتا تو ہم فکری اور نفسیاتی تبدیلی کے بغیر تغیر احوال کا خیال تک بھی دل میں نہ لاتے۔ لیکن ہم خدا کے خلاف محاذ کھڑا کر رہے ہیں جو اس سے (معاذ اللہ) کہہ رہے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ داخلی تبدیلی کے بغیر خارجی تبدیلی ناممکن ہے۔ ہم تمہیں ایسا کر کے دکھا دیں گے! خدا کے خلاف اس نبرد آزمائی کا نتیجہ ظاہر ہے۔ میں نے تشکیل پاکستان کے بعد پہلی بات یہ کہی تھی کہ موجودہ قوم جیسی تیسی بھی ہے' اس کے ذمے یہ فریضہ عائد کرو کہ یہ اس خطہ زمین کو محفوظ رکھے اور اپنی آنے والی نسلوں میں فکری تبدیلی کا تفصیلی پروگرام مرتب کرو ۔ یعنی ان کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام کرو۔ ارباب قوم نے اس مشورہ کو در خور اعتنا ہی نہ سمجھا۔ جب حالات بگڑنے لگے تو قوم کی طرف سے "عملی پروگرام" کے تقاضے شروع ہو گئے۔ میں نے ہر تقاضا کے جواب میں قرآن کی اسی تاکید و تنبیہ کو دہرایا۔ جواب ملا کہ یہ تو بڑا لمبا پروگرام ہے۔ آہ کو چاہئے ایک عمر اثر ہونے تک ---- اور کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔ میری مشکل یہ تھی کہ مجھے قرآن سے کوئی (Short Cut) نہیں ملتا تھا۔ اس لئے میں اس کے تجویز کردہ پروگرام کے سوا کوئی پروگرام بتا نہیں سکتا تھا۔ پچیس سال سے یہی ہو رہا ہے۔ جوں جوں

حالات ابتر ہوتے جاتے ہیں' حساس قلوب کی تڑپ اور خلش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور "عملی پروگرام" کے تقاضے شدید سے شدید تر! اب "خدا کے خلاف محاذ آرائی" کا نتیجہ (آپ کے الفاظ میں) اس قدر ہولناک۔ خطرناک اور اندوہناک بن کر سامنے آرہا ہے کہ ہم پر کپکپی طاری ہو رہی ہے اور مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے۔ اب حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ خود اس خطہ زمین کا مستقبل مخدوش نظر آتا ہے۔ ان حالات میں' پہلا کام تو یہ ہے کہ اس خطہ زمین کو کسی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ یہ کام ارباب نظم و نسق ہی کے کرنے کا ہے۔ میرے آپ کے بس کا نہیں۔ ہم حکومت کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے موثر پروگرام وہی تجویز کر سکتی ہے۔ اگر (اور جب) اس خطہ زمین کی حفاظت کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر طریق کار وہی اختیار کرنا ہو گا۔ جو قرآن نے بتایا ہے۔ ہم نے خدا سے ٹکر لینے کا نتیجہ دیکھ لیا ہے۔ اگر ہم اب بھی اپنی روش نہیں بدلتے تو قیامت سامنے کھڑی ہے۔ ہماری خاطر خدا اپنے قانون کو بدلنے سے رہا۔ وہ کسی کی خاطر بھی اپنا قانون نہیں بدلا کرتا۔ قانون اس کا یہ ہے کہ "جب تک کوئی قوم اپنے اندر فکری اور نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ اس کی خارجی دنیا میں تغیر نہیں ہو سکتا"

والسلام

کیا ہم آزاد ہیں؟ اس خطاب کا علیحدہ پمفلٹ بھی دستیاب ہے۔ قارئین طلوع اسلام زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگوا کر اس کی اشاعت عام کریں۔ قیمت صرف ایک روپیہ (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام

عوام سے

گذشتہ 47 برس میں پاکستان کی سیاست نے جس کی ہواؤں میں تم نے سانس لیا اور جس کی فضاؤں میں تم نے نشوونما پائی۔ تمہیں قانون شکنی اور نافرمانی' سرکشی اور عناں تابی سکھائی۔ اور مسلسل و پیہم یہ تعلیم دی کہ عدول حکمی میں راز حریت اور آئین فراموشی میں اصل آزادی ہے۔

تمہیں یہ بتایا گیا کہ جب بھی کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف ہو' اس پر بگڑ جاؤ' شور مچاؤ' تقریریں کرو' جلوس نکالو' اور "انقلاب زندہ باد" کے کہکشاں گیر و ثریا بوس نعروں سے فضاؤں میں تہلکہ مچا دو۔ قانون اپنے ہاتھ میں لے لو' بس اسی میں تمہاری جیت ہے اور اس جیت کا نام آزادی ہے۔

رفتہ رفتہ تمہاری حالت یہ ہو گئی کہ آئین و ضوابط کی پابندی تمہارے لئے سامان موت اور حدود و قیود کی رعایت تمہارے لئے پیام مرگ بن گئی۔ نظم و ضبط کا مطالبہ تم پر سخت شاق' اور رسم و آئین کا تقاضا تم پر بے حد گراں گذرنے لگا' تمہاری طبیعت' بے آئینی کی خوگر اور تمہارا مزاج بد نظمی کا عادی ہو گیا۔ نظم و آئین تمہارے نزدیک غیر فطری اطواق و سلاسل اور قوانین و ضوابط تمہاری نگاہ میں قید و بند کے آصار بن گئے۔ ذرا سوچو! کہ اس طرح دنیا میں کوئی نظم قائم اور کوئی حکومت مستحکم ہو سکتی ہے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احمد حسین قیصرانی

غلو

دین اور مذہب۔ کے تقابلی جائزے میں یہ امر نہایت اہمیت کا حامل نظر آتا ہے کہ دین میں ہر چیز اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہے' جبکہ مذہب میں عقیدت مند اپنی پسندیدہ شخصیات کی شان میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ دین کی رو سے حسن نام ہے توازن و تناسب کے صحیح صحیح ہونے کا۔ غلو' خواہ عمل میں ہو یا عقائد میں حسن کو بگاڑ دیتا ہے۔

گذشتہ ماہ ہماری قریبی مسجد میں عشاء کی نماز کے بعد عید میلاد النبیؐ کے سلسلے میں نہایت شاندار تقریب منانے کا اعلان کیا گیا نعت خوانوں کا ایک طویل سلسلہ ختم ہوا تو تقریر شروع ہوئی مقرر نے بے شمار روایتوں اور حکایتوں سے شان رسولؐ بیان کی۔ شان سے مراد ان کے نزدیک شائد حسن صورت ہی تھا۔ حضور پاکؐ کے حسن کا نقشہ کھینچتے ہوئے آپ کا موازنہ کبھی چاند سے کرتے اور کبھی حسن یوسفؑ کو سامنے لے آتے۔ قلت وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی طویل تقریر صرف دو گھنٹوں میں سمیٹتے ہوئے بغیر کسی حوالے کے ایک حدیث پر ختم کی جس کا ملخص یہ تھا کہ :

حضرت ابوہریرہؓ نے بیان فرمایا "ایک رات میں مسجد نبویؐ میں پہنچا تو رسول پاکؐ بھی تشریف فرما تھے' اوپر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا تو کبھی آپؐ کے چہرہ انوار پر غور کرتا۔ مگر خدا کی قسم ! رسول پاکؐ کا چہرہ چاند سے بھی زیادہ خوبصورت تھا"

رسول پاکؐ کے حسن کو چاند سے بڑھانے کی سند انہوں نے یہ بیان کی کہ میں اور آپ چاہیں تو جوش عقیدت میں آکر غلو سے کام لیں مگر صحابہ کرامؓ حقیقت ہی بیان کرتے تھے کیونکہ دین میں غلو کی اجازت نہیں۔

بلا شبہ صحابہ کرامؓ حقیقت ہی بیان کرتے تھے لیکن اس کا کیا علاج کہ تاریخ نے بہت سارے ایسے بے تکے اور بے مقصد واقعات ان کی طرف منسوب کر دیئے ہیں کہ لفظ لفظ پر انسان استغفراللہ پکار اٹھتا ہے۔

قرآن میں یہ تو کہیں نہیں آیا کہ اپنے بزرگوں کی شان میں گستاخی نہ کرو کیونکہ کوئی بھی ایسا نہیں کرتا۔ لیکن ایک ایسی چٹان سے بالخصوص آگاہ کیا ہے جو بالعموم نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے مگر دین کی کشتی اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ یہ خطاب اگرچہ اہل کتاب سے ہے' مگر تنبیہ ہمارے لئے۔

یا ھل الکتب لا تغلوا فی دینکم (4/171)

اے اہل کتاب ! دین میں غلو (مبالغہ) مت کیا کرو۔

ہمارے ہاں یوں تو ہر بزرگ ہستی کی شان میں مبالغے سے کام لینا محبت کی نشانی سمجھا جاتا ہے مگر رسول اللہ سے متعلق محافل میلاد میں بالخصوص جذب و کیف کے عالم میں قرآن کی اس نص صریح کے خلاف کہا' سنا اور سر دھنا جاتا ہے۔

مذاہب عالم میں اعتقادات' نظریات اور تصورات کی جو خرابیاں بھی نظر آئیں گی وہ اکثر اسی قسم کے غلو فی الدین کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

ہندو دھرم میں اوتار بنا لیا گیا۔ اوتار کے معنی ہی خدا کا بشکل انسانی دنیا میں آجانا ہے۔

عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کو تثلیث کی رو سے خدائی میں حصہ دار ہی نہیں' خود خدا بنا ڈالا اور خدا کا بیٹا بھی۔ بعد ازاں اسے آسمان پر لا بٹھایا۔

زرتشتوں کے ہاں مترا (Mithra) کا بھی یہی مقام

ہے زرتشتی عقیدہ کے مطابق وہ آخری زمانہ میں پھر دنیا میں آئے گا۔ اس کے ہاتھوں بالآخر حق کی فتح اور باطل کی مکمل شکست ہو گی۔

بدھ مت والے خدا کے تو قائل نہیں ہیں تاہم بدھ کی پرستش کرتے ہیں اور اسے معبود بنا رکھا ہوا ہے۔

دنیا کے ہر مذہب نے اپنے بانی یا رسول کو اپنے مقام سے آگے بڑھایا۔ جس سے دین مذہب میں تبدیل ہو گیا اور اس پر ایک اور رسول کے بھیجنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ رسول چونکہ شرف انسانیت کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے اس لئے اسے اگر اپنے مقام سے ذرا بھی آگے بڑھایا جائے تو وہ مقام الوہیت پر جا پہنچے گا۔۔۔۔! سابقہ قوموں کے لئے یہ آسانی تھی کہ ایسی صورت میں اللہ کا کوئی پیغمبر آکر انسانوں کو پھر سے راہ راست پر ڈال دیتا مگر ہماری مشکل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا اب آخری بار قرآن پاک میں کہہ دیا ہے۔

قرآن کریم میں واضح احکامات کے باوجود مسلمانوں نے بھی غلو میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جو بات نثر میں کہنا مشکل ہوئی وہ شعر میں کہہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف اور شاعری ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ تصوف سے مراد اخلاص اور محبت کی انتہا لیا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے ابتدائی دور میں دو شعر کہے تھے لیکن بعد ازاں انہوں نے ان کو حذف کر دیا مگر اب بھی ان متروک اشعار کو پیش کیا جاتا ہے۔

نجف میرا مدینہ ہے، مدینہ میرا کعبہ ہے
میں بندہ اور کا ہوں، امت شاہ ولایت ہوں
جو سمجھوں اور کچھ خاک عرب میں سونے والے کو
مجھے معذور رکھ میں مست صہبائے محبت ہوں

نجف میں حضرت علیؓ کا مرقد ہے جسے بڑھا کر مدینہ سے نسبت دی گئی ہے اور مدینہ کو کعبہ سے۔۔۔۔ اس سے آگے رسولؐ اللہ کو "رسول" سے سوا کچھ "اور" سمجھ لیا گیا اور اس کے لئے دلیل یہ کہ محبت کی مجبوری ہے۔ دوسرے مذاہب کے پیروکار بھی تو محبت ہی سے اپنے پیشواؤں کو بڑھا کر پیش کرتے تھے۔ اگر ہندو رام کو خدا، کرشن کو اوتار اور عیسائی مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں تو ہم انہیں مشرک اور کافر سمجھتے ہیں۔ معاملہ اپنا ہو تو اس مبالغے کو والہانہ عقیدت اور محبت کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کے بے شمار اشعار کھلے عام شان رسالت بیان کرتے ہوئے سنائے جاتے ہیں جن پر ارباب معرفت وجد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہی جو مستوئ عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

"استویٰ علی العرش" قرآن میں اللہ تعالیٰ کے متعلق آیا ہے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں دیکھئے۔

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے
مگر حقیقت میں عین رب ہے

اور پھر "احد" اور "احمد" کو ایک ہی زمرے میں بتایا جا رہا ہے۔

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزم یثرب میں آکے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

حتیٰ کہ

ھوالاول، ھوالاخر، ھو الظاہر ھو الباطن
بکل شئی علیم، لوح محفوظ خدا تم ہو
نہ ہو سکتے ہیں دو اول، نہ ہو سکتے ہیں دو آخر
تم اول اور آخر، ابتدا تم، انتہا تم ہو

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

شعور آدمیت ناز کر اس ذات اقدس پر
تیری عظمت کا باعث ہے محمد کا بشر ہونا

حیرت ہے کہ یہی کچھ غیر مسلم کریں تو گمراہ۔ ہم کریں تو کار ثواب! حالانکہ ہمارے نزدیک تو یہ بھی غلو ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی کسی ایک صفت کو زیادہ اہمیت دے اور دوسری صفت کو نظر انداز کر دے۔ جیسے عیسائیوں نے اللہ کی صفت 'رحم' میں اس قدر مبالغہ کیا کہ اس کے قانون مکافات عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ نجات و سعادت کو اعمال پر نہیں

ینہ اس کے رحم پر موقوف کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا س پر عیسائیت کی تاریخ شاہد ہے۔ قرآن کریم' صفات خداوندی میں اعتدال اور صحیح تناسب کی تعلیم دیتا ہے۔

وللہ الا سماء الحسنٰی فادعوہ بھا ص وذروا الذین یلحد ون فی اسمائہ ط سیجزون ما کانوا یعملون
(7/180)

تم صفات خداوندی کو۔۔۔۔۔ جو کامل حسن و توازن کی مظہر ہیں۔ اپنے اندر اجاگر کرتے جاؤ۔ اور اس میں اعتدال اور توازن کا خیال رکھو۔ ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو ان میں سے کسی ایک صفت کو لے کر' افراط کی طرف نکل جاتے ہیں (اور یوں زندگی کا توازن کھو دیتے ہیں۔ (41/40) ان کی غلط روش بہت جلد اپنا نتیجہ اپنے سامنے لے آئے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

شہر و مقام		دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ	جمعتہ المبارک	10 بجے صبح
حیدر آباد	B-12 حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد	جمعتہ المبارک بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر۔ جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ' مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران %35 رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ:
ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر' بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)
ٹیلی فون: کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منظور احمد (ناروے)

تکلف برطرف

ضمیر! (یہ دراصل مونث ہے' مذکر غلط العام محض ہے)

"کیا آپ کا ضمیر مانتا ہے اس بات کو؟"

"ہاں بالکل! میرا ضمیر مانتا ہے' یہ کوئی ایسی بات نہیں- یہاں تو اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے"

یہ کیا بات ہوئی؟ یہ دو قریب ترین دوستوں میں اس قدر گہرا تضاد کیوں؟

یہ افسردہ اور بے چین کر دینے والی سرد جنگ کیوں؟؟؟

ضمیر' یہیں سے مضمر بنا ہے یعنی پوشیدہ' عربی میں 'ضامر' اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کا پیٹ لاغری یا مشقت کی وجہ سے چھپا ہوا ہو- ضمیر کا مطلب ہوا' ہر وہ بات جسے کوئی اپنے دل میں چھپائے رکھے- قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا جن میں یہ ہمارے ہاں مستعمل ہے- وہاں 'نفس' کا لفظ ہے جو ایک طور پر یہی مفہوم دیتا ہے- یہ ضمیر ہے کیا چیز؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں سے آتا ہے؟ کہاں چلا جاتا ہے؟ اس کی طرف تو بعد میں آئیں گے' پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان افسانہ ہائے ضمیر کے نتائج و عواقب کیا مرتب ہو رہے ہیں' خود انسان پر اور پھر پورے انسانی معاشرے پر-

آج کون ہے جو خوف و حزن میں مبتلا نہیں؟ کون ہے جو گھٹن کے کرب و بلا سے دوچار نہیں؟ Stress, Strain, Tension, Depression, Frunstration وغیرہ جیسے مشکل "مغربی الفاظ" جو صرف مغرب زدہ پڑھے لکھے امیر لوگ ("Heart Hunted") بولا کرتے تھے اور وہ بھی کبھی کبھار- آج یہ الفاظ ہر کوئی' ہر کہیں' بڑی فراوانی اور پورے مفہوم کے ساتھ اگل رہا ہے------ میک اپ کے باوجود' چہروں پر نمایاں کرب ان کے قلب و دماغ کے امراض کی کھلی چغلی کھا رہا ہے------ (ماتھا تو میرا اس وقت ٹھنکا جب اگلے دن فون پر ایک نانی اماں بتا رہی تھیں کہ انہیں Tension ہو گئی ہے)---- اسی حزن و پریشانی کو پھر چھپانے یا اس سے چھپنے کیلئے اپنے ارد گرد دیواریں------ کھڑی کر دی جاتی ہیں جو مسلسل اٹھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہیں- یہ بلند اور بے ہنگم غیر مرئی دیواریں مزید گھٹن اور انتہائی دبیز خوف کا باعث بنتی ہیں- کچھ سنائی نہیں دیتا- کچھ سجھائی نہیں دیتا- کچھ پلے نہیں پڑتا- یہ لمبی چوڑی اور فلک بوس کنکریٹ کی مضبوط دیواریں جو نظر تو بے شک نہیں آتیں مگر محسوس بہت ہوتی ہیں- ان کا تو محض تصور و احساس ہی بڑا خوفناک اور موجب عذاب ہوتا ہے- کیا یہ اس بے ساختہ و خود رو "ضمیر" ہی کا نتیجہ نہیں کہ-

برسوں سے کم و بیش روزانہ ملنے جلنے والے پکے دوست------ کیا واقعی سچے دوست ہیں؟ کیا ان کی عزت اور غیرت حقیقتاً سانجھی ہے؟ کیا وہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا سچے دل سے احترام کرتے ہیں؟ کیا وہ ایک دوسرے کیلئے تریاق مرض ہیں یا------ بتائیے زہر و ہلاکت؟؟ یہ بظاہر آپ کے دوست' کچے کیوں لگتے ہیں؟ یہ خوشنما و دلکش دوست' گلے سڑے کیوں نکلتے ہیں؟؟ ان کے منہ کی مہک میں لپٹے ہوئے بظاہر بے ضرر اور ہلکے پھلکے الفاظ------ سڑاند اور بدبو کا باعث کیوں بنتے ہیں؟؟؟ یہ اپنے بھی بیگانے سے کیوں لگتے ہیں؟ (دوسری طرف یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ ایک اجنبی یا گاہے گاہے ملنے والا' اپنا لگتا ہے' ہمدرد لگتا ہے' غمگسار ہوتا ہے) لیکن ان پکے اور

سچے یاران انجمن پر اعتماد کرنے کو دل کیوں نہیں مانتا؟ کیوں ہم ان کے ساتھ دکھ سکھ بانٹنے سے ہچکچانے لگتے ہیں؟ یہ مسکراہٹوں کی محفلیں' یہ قہقہوں کی مجلس حقیقی مزہ کیوں نہیں دیتیں؟ شائد یہ مسکراہٹیں جبری' با مروت اور پر تکلف ہیں' بے تکلف نہیں۔ شائد قہقہے کھوکھلے ہیں جو صرف گلے سے نکلتے ہیں' سینوں سے نہیں اٹھتے۔ باتیں صرف دماغ سے "سوچ سمجھ" کر کی جاتی ہیں' بے ساختہ قلب سے نہیں نکلتیں۔ کیوں؟ یہ اس قدر احتیاط کیوں؟ یہ خوف زدہ اور محتاط رویے کیوں؟ کیا رفاقت و اخوت ایسی ہوتی ہے؟؟؟؟ نہیں ! قطعاً" نہیں !! یہ قرب نہیں' محض فاصلوں کی کمی ہے۔ یہ ساتھ نہیں' صرف ہم آوارگی ہے۔۔۔۔۔ یہ ہم جولیوں کی محفلیں نہیں ہیں' یہ چند از خود مجبور لوگوں کا ہجوم ہے۔ ان کے جسم تو قریب قریب ہیں لیکن ان کے دل جڑے ہوئے نہیں (قرآن) ہائے یہ دوریاں' یہ فاصلے' یہ پربت نما پتھریلی دیواریں !!! ضمیر ہی نے تعمیر کی ہیں نا؟ کیا یہ ایسی پوشیدہ ضمیر کا ہی شاخسانہ نہیں :

جھوٹ' سب جانتے ہیں کہ باعث لعنت ہے۔ (لعنت چوروں پر کم' پوری شخصیت پر زیادہ پڑتی ہے۔) لعنت کا مطلب ہے معاشرتی عزت و وقار

(Prestige or Standing in Men's Mind) سے محروم ہو جانا (قرآن)۔ کیا یہ کم عذاب ہے کہ بھرے معاشرے میں کسی کو 'جھوٹا' کے لفظ سے یاد کیا جانے لگے؟؟ لیکن حرام ہے جو کوئی اس کی پرواہ کرتا ہو۔ جھوٹ بلا تامل بڑے دھڑلے کیساتھ بولا جا رہا ہے۔ (کبھی کبھی سچ بھی بولتے ہیں لیکن' صرف ناگزیر صورتوں میں یا جب سچ کے پھیل جانے کا یقین ہو جائے۔۔۔۔)

آج کی دنیا کا انسان کس قدر بداعتماد ہو چکا ہے' اس کی واضح مثال عدالتوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ قرآن و گیتا پر ہاتھ رکھوانے کے باوجود' ملزم کی بات سچی نہیں مانی جاتی اور وکلا صاحبان (کاش ! صرف یہی طبقہ سچائی کا ساتھ دینا شروع کر دے)' اس کے ساتھ زور آور اور پیچ دار جرح کرتے ہیں۔۔۔۔ بھئی اگر جرح ہی کرنی ہے تو پھر اس قسم کا مطلب؟؟؟ سوچئے گا ذرا' کیا یہ قرآن کریم کی اہمیت کم کرنے یا اس کے ساتھ مذاق کرنے کے مترادف نہیں؟؟ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے "عدالتی قسم" آخری چارہ ہوتا ہے' ابتدائی رسم نہیں۔

سچ بولنے سے میری مراد قطعاً" یہ نہیں کہ ہم اپنی ذاتی بات' کسی اور کے راز کی بات یا گھر کی بات ہر ہما شما سے کرتے پھریں۔ قطعاً نہیں۔ یہ تو پرلے درجے کی بے وقوفی' چغل خوری اور لترا پن ہے۔ دانشمندی' سچائی یا کھرا پن (Fairness) نہیں۔ سچ بولنے سے میری مراد بھی وہی ہے جو آپ کی مراد ہے۔ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کہاں اور کس کے سامنے سچ بولنا کیوں فرض ہے' اور کہاں اور کس کے سامنے جھوٹ بولنا یا چپ رہنا گناہ ہے' زیادتی ہے' بددیانتی ہے' ظلم ہے۔ لیکن ہم بلا خوف جھوٹ بولے جا رہے ہیں۔ نتیجہ؟ وہی خوف' وہی حزن جس سے بچنے کیلئے' بزعم خویش' یہ کچھ کیا جا رہا ہے۔ حزن (Anxiety) بڑی ہی نامراد کیفیت کا نام ہے اور اس کے نتائج بڑے ہی جانکاہ۔ یہاں یورپ میں اس چھپی (وہی مضمر۔۔۔) بلا کے بارے میں تشویش و تفتیش حیران کن ہے۔ اس کی تشخیص اور سدباب کیلئے جگہ جگہ تنظیمیں بنائی جا رہی ہیں اور ___ آخری مراحل کے طور پر ____ خود کشی پر قناعت کر لی جاتی ہے۔۔۔۔ کیا یہ جرات ضمیر ہی کا نتیجہ نہ تھا؟؟؟

؎ یہ کیا ہوا تیری دنیا کو اے خدائے کریم
کہ زندہ لوگ ترستے ہیں زندگی کیلئے

کیا یہ اسی ڈھیلے ڈھالے ضمیر ہی کا ہلکا پن نہیں کہ :

منافقت' منافق۔۔۔ سب خوش اور سب رنگ آدمی کو کہتے ہیں (قرآن)۔ یہ لوگ کسی کو بھی خفا نہیں کرتے۔ نہ تنقید کرتے ہیں نہ ہی انہیں غصہ آتا ہے۔ انہیں سارے رنگ ڈھنگ اچھے اور بھلے لگتے ہیں۔ بہت "ہر دلعزیز" اور محفل کی جان ہوتے ہیں۔ دل و جان کے مذکورہ بالا رشتوں میں مسلسل بندھے نظر آتے ہیں۔ جی ہاں ! صرف نظر آتے

ہیں۔ پشتو کی کہاوت ہے : "ہر کسی کا یار، کسی کا بھی یار نہیں ہوتا"۔ ان لوگوں کی کوئی پہچان یا کوئی تشخص اس لئے نہیں ہوتا کہ ان کی کوئی Convictions (یقینی نظریات) نہیں ہوتیں سوائے اس کے کہ یہ Open for Everyone ہوتے ہیں۔ (قرآن)۔ ہمیشہ غیر جانب دار رہتے (Neutral, Taking neither Side in Dispute) ہیں۔ منافق کے لفظی معنی ہی یہی ہیں۔ (اس پر مستزاد یہ کہ یہ ہر دوسرے شخص کو جو React (رد عمل) کا مرتکب ہوتا ہے، چاہے یہ رد عمل برسوں بعد ہی کیوں نہ ہو، بددماغ اور جذباتی قرار دے دیتے ہیں حالانکہ ابھی کل ہی اسی بددماغ اور غصیلے بندے کو خوش خلق کہا جا رہا تھا۔) ___ ہر دلعزیزی کے نشے میں مبتلا ان لوگوں کی چیخیں تب نکلتی ہیں جب انہیں کسی تنازعے یا اختلاف میں ثالث مقرر کرنے سے ہر کوئی (خود یہ ضمیر کا قیدی بھی) انکار کر دیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ : "اجی چھوڑیئے! انہوں نے کیا انصاف کرنا ہے جو ابھی تک اپنے بارے میں کوئی فیصلہ، کوئی انصاف نہیں کر پائے---- پھر اپنی چیخوں کو روکنے کیلئے ضمیر کے نام پر اپنے گرد ایک اور دیوار چن لی جاتی ہے۔ آہ! یہ کچی دیواریں، کھوکھلے ضمیر کے خس و خاشاک پر مبنی گارے---- کے بنے یہ ناپختہ سہارے-----

حسد، کینہ، بغض اور احساس کمتری و برتری وغیرہ کیا ہیں؟ اسی خود ساختہ ضمیر کے بدنما داغ اور سرخ چھینٹے، جب یہ ضمیر مجروح یا قتل ہوتا ہے۔ پھر بداعتمادی کی ہر سکوت اور خوفناک فضا ہر جانب چھانے اور گہری ہونے لگتی ہے۔ اپنوں اور اپنے ہی دوستوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ Face کرنا تو درکنار، رسمی سلام کلام کی بھی جرات نہیں رہتی۔ دیواروں کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن، وہاں گھٹن اور بڑھنے لگتی ہے۔ دل ڈوبنے لگتا، ندامت کے آنسو ابلنے لگتے ہیں۔ چیخیں نکلتی ہیں لیکن سنے کون؟ اپنی ہی دیواروں سے ٹکرا کر یہ چیخ و پکار اپنی ہی طرف پلٹ جاتی ہے اور جسم لرزنے لگتا ہے۔ تنہائی ڈسنے لگتی ہے اور جسم درد اور زہر سے بھر جاتا ہے----

جینے کی تمنا ہے نہ مرنے کی آرزو
بیٹھے ہیں لب گور و در، کوئی ہمیں ستائے کیوں

اب آیئے چلتے ہیں اس ضمیر (Conscience) کی Definition، عمومی تعریف کی طرف :

"The Sence of right and wrong that governs a person's thoughts and actions"

یعنی ایک خصوصی شعور حق و باطل (خیر و شر/نیکی و بدی) جو انسان کے خیال و عمل کی رہنمائی کرتا ہے۔ گویا ایک کسوٹی (Touch Stone/Criterion) جو مطلق خیر و شر (Absolute good and evil) فرق و تمیز کر سکتی ہے۔ اور یہ خیال عام ہے کہ ضمیر کی آواز ہر انسان کے سینے مین موجود ہوتی ہے۔ یہ اسے فطرت کی طرف سے پیدائشی طور پر ملتی ہے اور یہی چیز انسان کو حیوانات سے متمیز کرتی ہے۔ حیوان کے سینے میں ضمیر کی آواز نہیں ہوتی (وہ مجبور ہوتا ہے---) اس کا مہبط صرف قلب انسانی ہے۔ لہٰذا ہر انسان از خود کھرے کھوٹے، مطلق حق اور مطلق باطل یا حلال و طیب اور حرام و مکروہ میں امتیاز کر سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟ قطعاً" نہیں ! ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ مختلف اشخاص کا ضمیر درست اور غیر درست یا طیب اور مکروہ کے متعلق الگ الگ فیصلے دیتا ہے۔ چھوٹے پرندوں کا گوشت ایک مسلمان چٹخارے لے لے کر اڑا جاتا ہے جبکہ ایک نارویجن کو اس کے تصور ہی سے قے آنے لگتی ہے۔ یا مثلاً ایک یورپین کا تصور حیا یا احساس عزت و غیرت (اگر ہے تو) بالکل مختلف ہے ایک ایشین مسلم کے مقابلے میں۔ ہمارے ہاں تو گالی بھی وجہ قتل بن جاتی ہے۔ جبکہ مغرب میں گالی اس قدر بے آبرو ہو چکی ہے کہ اس کا ذکر بھی قطعاً" ضروری نہیں رہا---- ایک اور مشاہدہ ہے کہ ایک شخص کے نزدیک جھوٹ بولنا بہرحال و بہرکیف ناجائز اور مطلق حرام ہے لیکن اس کے ایک دوست کے لئے جھوٹ بولنا بعض صورتوں میں جائز ہی نہیں، واجب بھی

—— کیا خیال ہے‘ کون سچا ہے؟ کس کا ضمیر حق کی ...وش دے رہا ہے؟ کس کی بات مانی جائے؟ جھوٹ بہر طور ...ے کو مطلق و ابدی سچائی سمجھا جائے یا نظریہ ضرورت کو ...قل قدر؟؟؟ ہے نا مسئلہ؟ انسانی دنیا کا یہی تو سب سے ... اور بنیادی مسئلہ ہے کہ : "کیا ہے‘ کیا ہونا چاہئے؟" ("What it is, What it ought to be")

مذکورہ بالا نام نہاد تعریف اور امر واقعہ کے مشاہدے کے بعد‘ پہلا سوال کہ یہ احساس یا شعور خیر و شر وجود پذیر کیسے ہوتا ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ اس سوال کا تعلق معاشرتی تعلیم و تربیت (Socialization) سے ہے۔ درحقیقت ہر انسان‘ عمومی طور پر‘ زندگی کے ابتدائی برسوں میں‘ اپنے اردگرد کے معاشرے اور ماحول کی غیر محسوس اور لطیف (Subtle) معاشرتی تدریس کے حصول کا "پابند" اور "مجبور" ہوتا ہے۔ مثلاً گھر‘ سکول اور دوسرے قریبی سماجی ادارے۔ ان ابتدائی سالوں میں وہ صرف وصول کرتا ہے۔ اس کا رویہ اپنے معاشرے کے رسم و رواج اور سوچ و اقدار کیلئے ہمیشہ مجہول (Passive) رہتا ہے۔ اول تو وہ رد عمل (Reaction) کا مرتکب ہی نہیں ہوتا‘ اور اگر ایسا کرنا چاہے بھی تو اسے گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہذا وہ اپنے گردوپیش کے خیالات و نظریات اور وقت کے واقعات و حالات کے دھارے میں بہنے لگتا ہے۔ طوعاً" و کرہاً" انہیں قبول کئے چلے جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی معاشرے ہی میں تعلیم و تربیت کا انداز و معیار مختلف نہیں ہوتا بلکہ خاندانوں اور گھرانوں کی روش و روایات میں بھی اختلاف بلکہ تضاد بھی ہوتا ہے‘ جمع مروثی اثرات۔ انہی ابتدائی نقوش (Impressions) اور ان کے اظہار (Expressions) کا نام ضمیر ہے اور بس۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ مختلف دائروں میں بٹی ہوئی جیسی تعلیم و تربیت ویسے ہی متضاد و متصادم ضمائر۔ تب عذاب تذبذب کا نزول شروع ہوتا ہے۔ ذہنی انتشار و خرافات کی وبائیں پھیلتی ہیں۔ جذباتی تعصبات کی بلائیں سر اٹھاتی ہیں اور پھر—— ان سے بخیال خویش بچنے کیلئے—— وہی دیواریں—— وہی پناہ گاہیں—— وہی تربیتیں——

کوئی بدحال‘ کوئی بے حال
آدمی کا مزاج ٹھیک نہیں
وہ بے مروت‘ یہ بداخلاق
واعظ کا علاج ٹھیک نہیں
یہ خود نما‘ اور وہ خود کش
دھرتی کا سماج ٹھیک نہیں
کوئی سرمست‘ کوئی افسردہ
میکدے کا رواج ٹھیک نہیں

آیئے اب آخر میں یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے ان تمام سلسلوں میں ہم انسانوں کی کیا رہنمائی فرماتی ہے۔ دراصل—— ضمیر انسانی—— واقعی ایک حقیقت ہے۔ اس سے انکار محال‘ اور اعراض جاہلیت ہے۔ ہم اس کی وجہ نمود بھی سمجھ چکے‘ اس کی سبق آموز اور عبرت ناک کار فرمائیوں سے روشناس بھی۔ لہذا—— یہ سمجھنا ایک کھلی گمراہی‘ بلکہ سازش ہے کہ معاشرہ چاہے کسی بھی طریق و منہاج پر مبنی ہو‘ انسانی ضمیر بہرحال یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ از خود داخلی طور پر (Subjectively) حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ کر ان کی فہرستیں مرتب کر دے۔ یہ غلط ہے۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ یہ‘ ضمیر کی آواز (وغیرہ) کی من مانی اور ایک خاص ذہنیت کی اپنی تراشیدہ تاویل (Strain Interpretation) ہے۔ اگر انسان (بکرے کی طرح) یہ تعبیر تسلیم کر لے تو پھر ظاہر ہے اسے کسی خارجی و نزولی علم (وحی) کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جانوروں کی جانب کبھی بھی اس طرح کی وحی نہیں اتری۔ وہ تو مشورے کو بھی منہ نہیں لگاتے—— کیا سمجھے آپ؟؟ (کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی کہ‘ زمین والوں پر آشوب آگہی سے بڑا عذاب‘ آج تک نہیں اترا——)

سچ بولنا‘ فی ذاتہ (Intrinsically) عمل خیر ہے‘ خواہ اس کے نتائج کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ جھوٹ‘ اپنی ذات میں عمل شر ہے‘ خواہ اس سے کتنا ہی فائدہ کیوں نہ سمیٹا جائے۔

ان اعمال کو بلا دلیل و حجت (A Priori) ایسا مانا جاتا ہے۔ دیانت داری بہرحال اچھی ہے' خواہ دنیا میں ایک شخص بھی اسے تسلیم نہ کرے اور بددیانتی بہر طور بری ہے' خواہ دنیا کے تمام لوگ بہ دلائل و براہین یہ ثابت کر دیں کہ نہیں! بددیانتی اچھی چیز ہے۔ ان کا برا اور اچھا ہونا' نہ وقتی نتائج کے اعتبار سے ہے نہ محتاج دلیل۔ اگر ہم اس کے لئے کوئی دلیل دے سکیں تو یہ اور بات ہے' لیکن ان کا اچھا یا برا ہونا دلیل پر موقوف نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کس طرح معلوم ہو گا کہ فلاں کام اپنی ذات میں اچھا ہے اور فلاں برا؟ خیر و شر اور حق و باطل کی فہرست کون اور کس معیار سے مرتب کرے گا؟؟ ضمیر انسانی کا تو حشر نشر ہم دیکھ ہی چکے اور عقل انسانی؟ تو وہ بھی اب گھٹنے ٹیکے اتم کنان ہے کہ ازل سے اب تک یہی فیصلہ نہیں کر پائی کہ آیا جذبات اس کے غلام ہیں یا وہ خود ان کی لونڈی۔ یہ وہ مقام ہے--- جہاں--- انسان کو بہر کیف و بہرحال' طوعاً" و کرہاً" ایک ایسے خارجی معیار (وحی) کی ضرورت پڑتی ہے جس کا سرچشمہ ایسی ذات ہو جو جذبات انسانی سے معرا ہونے کے علاوہ' زمان و مکان کی حدود سے بھی ماورا ہو۔ یعنی ذات خداوندی کی مقرر کردہ اقدار خداوندی جو آج صرف اور صرف قرآن کریم میں موجود و محفوظ ہیں۔ اس کے سوا' انسان کے پاس نہ کوئی چارہ ہے نہ کوئی قابل اعتماد معیار یا سہارا۔ اسے اس نور کائنات سے استفادہ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ--- ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ اس ضمیر کے قیدی نے اپنے علاوہ دوسروں کو بھی کن کن مصائب و مشکلات میں گرفتار کر رکھا ہے۔ جسم تو کیا' روح بھی لہولہان ہے۔

قرآن مجید نے' اوپر واضح کی گئی حقیقت ضمیر کے پیش نظر' ضمیر کیلئے 'نفس' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اس کی تین شکلیں (Aspects) یا کیفیات بیان فرمائی ہیں۔

1- نفس امارہ : ضمیر' جو انسان کو شر و تخریب پر آمادہ کرے' حکم دے۔ امر (حکم) سے ہی امارہ کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔

2- نفس لوامہ : انسان جس بات کو معیوب سمجھتا ہے' اس پر سرزنش ملامت کرنے والا جذبہ' ملامت کا لفظ یہیں سے آیا ہے۔

3- نفس مطمئنہ : مطمئن و اطمینان بخش ضمیر۔ عصر حاضر کی اصطلاح میں اسے Balanced Personality کہا جا سکتا ہے۔ اپنے خیالات و اعمال پر علیٰ وجہ البصیرت مسحور و مسرور ضمیر۔

ظاہر ہے کہ ضمیر کی ان تینوں کیفیات کا وجود و نمود' مرہون منت ہے خود انسان کے خیال و عمل کا۔ اس کے اختیار و ارادے کا۔ یہ انسان' شعور کی عمر کو پہنچ کر چاہے تو بلا چوں و چرا انہی لایعنی رسم و رواج اور نام نہاد روایات کے تحت بقیہ ساری عمر گزار دے اور "بااصول و زندہ ضمیر" کہلائے۔ چاہے تو اپنی یا کسی خارجی سوچ و فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کھوکھلی سوچوں اور تقلیدی عقیدوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دے۔ (افسوس! کہ اس طرح کے لوگ بہت کم سامنے آتے ہیں کہ یہ اقدام' بلند ذہنی سطح اور اعلیٰ کردار کے علاوہ' دل گردے کا بھی متقاضی ہوتا ہے۔) مفکرین معاشرہ یہی کرتے ہیں۔ (اور اسی لئے یہاں یورپ میں انہیں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔) یہی وہ جرات خیال کے نمایاں پیکر ہوتے ہیں جو اخلاقی' سماجی' معاشی اور علمی ارتقاء کی وجہ و ابتدا بنتے ہیں۔ ہر قوم و ملک اپنی ہر طرح کی ترقی و خوشحالی اور عظمت و سطوت کیلئے انہی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ باقی سب--- کاش! وہ بھیڑیں نہ کہلائیں' (ان کیلئے اپنی ہی دیواریں پھلانگنا ناممکن ہوتا ہے۔) بلکہ اپنے مدبرین قوم سے مستفید و مستفیض ہو کر' اپنے معاشرے کو اعلیٰ ترین اقدار پر استوار کریں۔ ضمیر--- پھر نہ امارہ رہے گا نہ آوارہ۔ نہ شرمندہ' نہ ملامت زدہ۔ بلکہ وہ یقیناً ضمیر مطمئنہ ہو گا' جنتی زندگی جس کا مقدر ہو گی' یہاں بھی اور وہاں بھی۔

خیال رہے! دانشوران قوم سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو خود سوچتے ہیں۔ اپنی فردوس گم گشتہ خود تلاش کرتے

ہیں۔ اندھے مقلد' یا بہتی گنگا ("معروف روش") میں اشنان کرنے والے لیڈران قوم نہیں۔ مستحق تبریک و تحسین اور سزوار عقیدت و احترام وہی ہیں جو صرف قرآنی فکر و عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس ! کہ امت مسلمہ میں فی الوقت اس امتزاج ذہن و عمل کی کارفرمائی عنقا ہے۔ اقبالؒ' پرویزؒ اور قائداعظمؒ کا امتزاج فکر عمل--- اب افسانہ سا لگنے لگا ہے--- خیر' ہم اداس تو ضرور ہیں اور بے چین بھی بہت' لیکن ہم ناامید ہرگز نہیں۔ وقت ایک جیسا کبھی نہیں رہتا۔ طلوع سحر یقینی ہے۔

"دین قرآن کب نافذ ہو گا پاکستان میں؟" علامہ غلام احمد پرویزؒ کی محفل میں کسی نے اچانک یہ سوال کر ڈالا۔ مسلسل بیماری نے آپ کی کمر تور دی تھی۔ علمی و فکری تنہائی کا کرب تو درکنار' (اس کے اظہار سے انہوں نے ہمیشہ اجتناب برتا) اب جسمانی نقاہت بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ ایک طویل اور کٹھن سفر کی تکان' اب ستانے--- کو تھی--- سوال کے جواب میں آپ نے پورے اعتماد اور تیقن کیساتھ ان چند علامتوں کی نشاندہی کرائی جو تغیر قلب کیلئے ناگزیر ہوتی ہیں۔ انہیں ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ حوصلہ دلایا۔ امید بڑھائی کہ یہاں جشن قرآن ضرور منعقد ہو گا۔ جشن آزادی قریب ہے۔ لیکن پھر' اچانک خاموش ہو گئے۔ آنکھوں میں حسرت کے آنسو پھیل کر چمکنے لگے اور-- بڑے ہی درد انگیز لہجے میں گویا ہوئے : "بہت دور نہیں' یہ جشن قریب ہے۔ یہ جشن پوری سج دھج کے ساتھ منانا---- لیکن ہم ----

محبت کرنے والے کم نہ ہونگے
تیری محفل میں' لیکن ہم نہ ہونگے"

پاکستانی مٹکے

بچپن میں ایک واعظانہ قصہ سنا کرتے تھے کہ جب حضرت نوحؑ اپنے متبعین کو ساتھ لے کر' کشتی میں سوار ہو گئے اور کفار سے کہدیا کہ آج اس طوفان بے پناہ سے کسی کو پناہ نہیں مل سکتی تو انہوں نے دیکھا کہ کفار نے بڑے بڑے مٹکے لئے اور انہیں پانی میں ٹھیل کر' ان پر تیرنا شروع کر دیا۔ اس سے حضرت نوحؑ کو سخت قلق ہوا اور انہوں نے بدرگاہ رب العزت دعا مانگی۔ اس پر اللہ میاں نے سخت تیز آندھی چلا دی جس سے وہ مٹکے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ گئے۔ اور ان کے سہارے تیرنے والے' سیلاب میں غرق ہو گئے۔ یہی حال ہمارے سیاستدانوں کا ہونے والا ہے۔

خوشخبری

باغبانی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے باغبان ایسوسی ایشن۔ مری کی خصوصی پیش کش۔ اگلے شمارہ میں دیکھئے۔

مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ

فرقہ واریت کا روگ اور اس کا علاج

عادت کیسی بھی ہو بہرحال برائی ہی ہوتی ہے۔ البتہ جب تک اس کا احساس باقی ہے واپس پلٹ جانے کا امکان رہتا ہے لیکن جب احساس ہی ختم ہو جائے تو وہ برائی۔ برائی نہیں رہتی بلکہ بعض اوقات ایک مقدس اچھائی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مذہبی فرقہ واریت بھی کچھ ایسی ہی برائی ہے جو پاکستان سمیت سارے عالم اسلام کے لئے ایک عذاب بنی ہوئی ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی اسے معیوب خیال کرتا ہے لیکن خود بھی کسی نہ کسی فرقے پر اعتقاد رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صدر اول کے اسلام پر ہماری خود ساختہ فرقہ بندیوں کی تہیں اس حد تک جم چکی ہیں کہ ہمیں احساس ہی نہیں رہا کہ فرقوں کی موجودگی اور اسلامی زندگی دو متضاد چیزیں ہیں۔ ہمارا ذہن یہ تلخ حقیقت گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں کہ فرقہ بندی کا اسلامی زندگی میں کوئی مقام نہیں۔

سوچ کے اس سراب میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری تمام تر مذہبی رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے جو اپنی پیشوائیت کے تقدس، مفاد خویشی اور جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر لوگوں کو اصل حقائق سے دور رکھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ...... رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "اختلاف رحمتہ" یعنی میری امت میں اختلاف رحمت ہے۔ آپ نے سوچا کہ بات کیا ہوئی؟ یعنی وہ اختلاف جس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وہ خدا کا عذاب ہے، باعث کفر ہے، شرک ہے۔ اسی اختلاف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ نے اسے باعث رحمت قرار دیا۔ ایک دوسری روایت بھی سنئے۔ حضور نے فرمایا کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے ان میں سے صرف ایک ناجی ہو گا، باقی سب جہنمی ہوں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں ایک فرقہ کی استثناء نے کس طرح ہر فرقے کو مطمئن کر دیا کہ وہ حق پر ہے اور باقی سب باطل ہیں۔ بعض جید علماء کرام مختلف مذہبی فرقوں کو مکاتب فکر کا نام دے کر امت مسلم کو فکری کلیوں کا گلدستہ کہتے ہیں۔ گویا فرقہ بندی ان کی نظروں میں دین کا حسن ہے۔ کچھ رہنماؤں کا خیال ہے کہ اگر باہمی رواداری قائم رہے تو فرقہ بندی چنداں نقصان دہ نہیں ہاں البتہ فرقہ واریت یعنی ان میں شدت نہیں ہونی چاہئے۔ ایک اور مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ وہابی، دیو بندی، بریلوی کہلانا غلط ہے۔ ہمیں اہلحدیث یا اہلسنت کہلانا چاہئے، کیونکہ حدیث اور سنت ہم معنی ہیں، حالانکہ یہ بھی ایک مفروضہ ہی ہے۔

یاد دہانی کے طور پر عرض کر دوں کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے، جس میں وحدت فکر و عمل کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ دین اگر فرقوں میں بٹ جائے تو دین نہیں رہتا مذہب بن جاتا ہے، جو خدا اور اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ جسے انسان کی تمدنی، سیاسی اور معاشی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس پرائیویٹ تعلق کو ہر کوئی اپنے طور پر خدا کی عبادت یا پرستش کر کے قائم رکھ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اسلام اور دنیا کے دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہتا اور یوں مذہب کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس "الدین" جس کا نام خدا نے الاسلام تجویز کیا ہے (3/18)۔ زندگی کا ایک ضابطہ اور نظام حیات ہے جس کا نفاذ نبی اکرمؐ کے بعد ہمارے ذمہ ہے اور جس میں حاکم مطلق بلا شرکت غیرے اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ مذہب یا دیگر مذہبی فرقوں کا کتاب اللہ میں کوئی ذکر

تیں ہے- وہاں جو کچھ ملتا ہے وہ یہی ہے کہ ان الدین عند للہ الا اسلام (3/18)- اور هو سمکم المسلمین (78/22)- جو ہمارے لئے بطور سند کافی ہے-

قرآن مجید کو سادہ ترجمے کے ساتھ پڑھنے والا قاری بھی ششدر رہ جاتا ہے کہ جب ضابطہ خداوندی کی متعدد آیات میں فرقہ بندی کی نفی اور مذمت موجود ہے تو آخر وہ کونسے حالات ہو سکتے ہیں کہ اتنے واضح احکامات کے باوجود امت مسلمہ فرقوں میں بٹ گئی- خیال سو فیصد درست ہے- ان حالات میں فرقہ سازی کا نہ کوئی جواز ہے اور نہ کوئی امکان- یہ محض باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ محرکہ تھا جو فرقہ سازی کا باعث بنا- جن لوگوں کے دل میں لیڈر بننے کا شوق چراتا ہے یا پیشوا بننے کی ہوس اٹھ آتی ہے ! وہ اپنا فرقہ الگ بنا لیتے- فرقہ بندی کو قرآن نے شرک کہا ہے- ہمارے علماء کرام اس ناقابل معافی گناہ سے بچاؤ کیلئے اپنے فرقوں کو مکاتب فکر یا مسالک کا نام دے کر خوش ہو لیتے ہیں- ان کی اس ناکام کوشش اور خود فریبی پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "ان کی حقیقت بس اتنی ہی کہ یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آبا و اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں- اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں اتاری" (7/71, 12/40)- مطلب یہ کہ نام کی تبدیلی سے جرم کی نوعیت نہیں بدل جاتی- ہم اکثر دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں کہ محراب و منبر سے توحید اور شرک کے مسائل بیان ہو رہے ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی دوسرے فرقوں پر تنقید اور اپنے مسلک کی تبلیغ بھی جاری رہتی ہے- اس وقت ہمارے خطیب حضرات شائد محسوس ہی نہیں کرتے کہ ایسا کرتے وقت وہ خود بھی شرک کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں-

قرآن کریم نے سورہ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی ہاروں کا ایک واقعہ بیان کیا ہے- جس میں گئو سالہ پرستی اور تفرقہ انگیزی کا ذکر ہے- ظاہر ہے یہ دونوں شرک ہیں لیکن تفرقہ انگیزی کا شرک اتنا شدید اور سنگین ہے کہ اس سے بچنے کے لئے عارضی طور پر گئو سالہ پرستی کا شرک گوارا کر لیا گیا- معلوم ہوا کہ تفرقہ بازی کا شرک گئو سالہ پرستی سے بھی زیادہ سنگین ہے- اس سے کم از کم ایسے حضرات کی خوش فہمی یا غلط فہمی تو دور ہو جانی چاہئے جو بات بات پر کہہ دیتے کہ صاحب ! اپنی اپنی جگہ پر سب ٹھیک ہیں- قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک نہیں ہیں- صراط مستقیم ایک ہی ہے- جب امت اپنی اپنی مختلف راہوں پر چل نکلے تو پھر صراط مستقیم کسی کے سامنے بھی نہیں رہتا- سورہ الانعام میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے- "یاد رکھو ! میرا یہی ایک سیدھا راستہ ہے- بس تم سب اس کا اتباع کرو- اس کے سوا دوسرے راستوں پر نہ چلو- وہ راستے تمہیں اس صراط مستقیم سے متفرق اور پراگندہ کر دیں گے- اللہ نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے تاکہ تم تقویٰ شعار رہ سکو"- (154/6)

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں- مروجہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں- ان کے باہمی اختلافات اتنے شدید ہیں کہ کفر کے فتوؤں تک نوبت چلی گئی ہے- لیکن عجیب بات ہے کہ اپنے پیغمبر کی والہانہ عقیدت- محبت اور اطاعت کے سب کے سب مشترکہ طور پر دعوے دار ہیں- ہر کوئی ان کے فرمان کی تعمیل بہت بڑی سعادت سمجھتا ہے- کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پہلے پیغمبرؐ اسلام اور امت مسلمہ کے باہمی تعلق کا معیار بتا دیا جائے- پھر اگلی بات کی جائے- یوں تو کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا- لیکن فرض کریں کہ ایسے جلیل القدر اور غمگسار پیغمبرؐ سے خدانخواستہ ہمارا تعلق واسطہ ہی نہ رہے تو ایسی صورت میں ہمارے پاس باقی کیا رہ گیا- دین و دنیا دونوں ویران ہو جاتے ہیں- یقیناً امت کے لئے اتنی بڑی اور کڑی سزا اور کوئی نہیں ہو سکتی- بھلا وہ جرم کونسا ہے؟ ملاحظہ فرمائیں- اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں- مفہوم .... " دین ایک راستے پر چلنے کا نام ہے- مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں- جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں- اے رسول ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں- ان کا معاملہ قانون خداوندی کے سپرد کر دو- وہی

بتائے گا کہ ان کی اس روش کا کیا نتیجہ ہو گا"۔ (6/160)۔

حضور نبی اکرمؐ کے زمانہ میں تفرقہ انگیزوں نے ایک نئی مسجد تعمیر کی۔ تو قرآن نے جس شدت سے اس کی مخالفت کی اس کا اندازہ سورہ توبہ کی متعلقہ آیات سے لگ سکتا ہے۔ سنئے اور غور سے سنئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے "جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد تعمیر کرائی کہ اس سے ملت اسلامیہ اور خود دین کو نقصان پہنچایا جائے تم اس مسجد کو مسجد سمجھتے ہو؟ یہ مسجد نہیں یہ وہ کمین گاہ ہے جس میں بیٹھ کر وہ شخص جو اس سے پہلے خدا اور رسول کا دشمن تھا ملت پر تیر اندازی کرے گا" (9/107)۔ یہ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اس مسجد کی تعمیر سے ہمارا ارادہ بجز بھلائی اور کچھ نہیں۔ ہم دین کی تخریب تھوڑا چاہتے ہیں" " تم ان کی باتوں میں نہ آجانا۔ خدا گواہ ہے کہ یہ یکسر جھوٹے ہیں"..... "اے رسول تم اس مسجد میں ایک قدم بھی نہ رکھنا" یہ مسجد یونہی سمجھئے کہ دوزخ کے کنارے کھڑی ہے۔ جس نے اسے بنایا ہے اور جو اس میں داخل ہو گا' یہ ان سب کو لیکر جہنم کے عمیق گڑھے میں جا گرے گی" (9/107-109)۔ چنانچہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ رسول اللہ نے صحابہؓ کو بھیج کر اس مسجد کو منہدم کرا دیا۔ قرآن کے اس مفہوم کی روشنی میں اب فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے۔ کہ مسجد ضرار کے الزام سے عالم اسلام کی کتنی مساجد بچ سکتی ہیں۔ جنہیں ہم اللہ کا گھر کہہ سکیں۔

سورہ آل عمران میں کہا گیا کہ "دیکھنا! تم بھی کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا۔ جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح حقائق مل جانے کے بعد فرقے بنا لئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگ گئے۔ ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے" (3/104)۔

سورہ الروم میں فرمایا کہ مفہوم ..... "لہٰذا تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس طرح توحید کے پیرو بن کر پھر مشرک نہ بن جاؤ۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح امت واحدہ رہنے کی بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ اس خیال میں مگن رہتا کہ میں حق پر ہوں۔ باقی فرقے باطل ہیں" (30/31-32)۔

ان آیات مقدسہ کو پڑھ کر ایک اہم سوال سامنے آیا کہ مروجہ عقائد کے برعکس تفرقہ انگیزی کیوں اتنا سنگین جرم ہے۔ جس کے لئے خدا نے جہنم کا عذاب' تباہی اور بربادی کی انتہائی سزا مقرر کر رکھی ہے اور جس کے لئے بارگاہ خداوندی میں بخشش کی کوئی گنجائش نہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تفرقہ قرآن کی رو سے شرک ہے۔ (30/31-32)۔ اور شرک ایک ایسا گناہ ہے۔ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور شرک سے نیچے جو کچھ ہے۔ جسے چاہے معاف فرما دیتا ہے اور جس نے خدا کا شریک ٹھہرایا۔ اس نے بڑا گناہ کا طوفان باندھا" (4/48)۔ سوال کا جواب تو قرآن سے مل گیا کہ تفرقہ شرک ہے اور شرک کیلئے خدا کے قانون (مکافات عمل) کی رو سے کوئی معافی نہیں ہے۔ بات صاف ہو گئی۔ لیکن اس جواب سے ایک اور سوال پیدا ہو گیا کہ تفرقہ کو کیوں شرک کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ تفرقہ دین کو ختم کر کے امت مسلمہ کو مختلف فرقوں کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور یوں ضابطہ خداوندی کی جگہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ جس سے ہمارے مذہبی پیشوا حق حکومت میں خدا کے ساجھی (شریک) بن جاتے ہیں جب کہ اسلامی نظام میں حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے" (12/40)۔ اور "وہ اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا" (18/26)۔ جہاں تک خدا کے حق حکومت کی عملی شکل کا تعلق ہے تو اس کے لئے فرمایا کہ " (اے رسول ان سے کہہ دو) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم بنا لوں در آنحالیکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیج دی ہے۔ جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے" (115/6)۔ اسی لئے خود حضور نبی اکرمؐ سے جنہوں نے سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی تھی کہا گیا کہ "تو ان میں کتاب

اللہ کے مطابق حکومت قائم کر" (5/48)- بہ الفاظ دیگر کتاب اللہ کی اطاعت ہی خدا کی محکومیت ہے- لیکن جب فرقے بن جائیں تو کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ مذہبی علماء کے خود ساختہ قوانین کی گنجائش بھی نکل آتی ہے- اس سے نہ صرف دین ختم ہو جاتا ہے- بلکہ انسان بھی خدائی اقتدار میں شریک ہو جاتے ہیں اور یوں ایک متوازی نظام حکومت کی صورت پیدا ہو جاتی ہے-

سورہ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے قرآن خالص کی رہنمائی کو صحیح اور حق قرار دیا ہے- لیکن اس میں اگر کسی انسانی قانون (خود ساختہ قانون) کی آمیزش ہو جائے تو وہ تمام تر باطل لہٰذا شرک ہو جاتا ہے- فرمایا "یہ خدا کی طرف سے عطا شدہ وہ رہنمائی ہے- جس سے ہر وہ شخص جو صحیح راستے پر چلنا چاہے- صحیح راستے کا پتہ نشان پا لیتا ہے- لیکن اگر یہ لوگ شرک کریں- یعنی اس حق کے راستے کیساتھ (باطل کے) راستوں کو بھی ملا لیں تو ان کے اعمال ضائع چلے جائیں گے" (6/89)- اسی طرح جب ایک ملت کے بجائے متعدد فرقے اور ایک ضابطہ کے بجائے مختلف شریعتیں بن جائیں تو قرآن نے اسے بھی شرک قرار دیا ہے اور وہ علماء و مشائخ جو ایسے فرقے اور راہیں تجویز کرتے ہیں قرآن کے ہاں خدا کے شریک کہلاتے ہیں- مثلاً فرمایا کہ "خدا کے یہ شریک وہ ہیں جو اس کے دین (نظام زندگی) میں مختلف راہیں (شریعتیں) وضع کرتے رہتے ہیں- ایسی راہیں (شریعتیں) جن کا حکم خدا نے نہیں دیا- ایسی ہی شریعتوں کو ان کے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) شریعت خداوندی کہہ کر پیش کرتے اور ان سے ان کی اطاعت کراتے ہیں" (42/21)-

ان آیات مقدسہ کی روشنی میں ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے قانون میں اس کا کوئی متبادل تجویز کرنا یا احکام خداوندی میں اپنے وضع کردہ قوانین شامل کرنا شرک ہے اور فرقہ بندی میں تو سارا 'اسلام' ہی اسی قسم کے ضابطہ پر مشتمل ہوتا ہے- لہٰذا وہ شرک کی خدائی دفعات سے نہیں بچ سکتا-

بدقسمتی سے ہمارے علماء کرام ان حقائق سے اتفاق نہیں کرتے اور دھڑا دھڑ اس عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں- وہ نہیں جانتے کہ شرک یہی نہیں ہوتا کہ بتوں کی پوجا کی جائے یا مزاروں پر دیئے جلائے جائیں بلکہ خدا کے قانون کیساتھ کسی اور کے قانون کو شریک کرنا بھی ایک مہا شرک ہے" (18/26)- اور پھر ہمارے ہاں تو یہ رسم بھی چل نکلی ہے کہ اپنے وضع کردہ قوانین کو بھی خدا کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے- قرآن کہتا ہے کہ جو شخص اپنے جی سے باتیں گھڑے اور ان کے متعلق کہے کہ وہ خدا کی وحی ہیں بہت بڑا مجرم ہے" (10/17)-

اس وقت عالم اسلام میں امت واحدہ کی کوئی شکل نظر نہیں آتی- ہر کوئی شعوری یا غیر شعوری طور پر شرک کا مرتکب ہو رہا ہے- پچاس سے زائد اسلامی ممالک ہیں- جو اپنے مسلکی مذاہب میں بٹے ہوئے ہیں- غربت- افلاس- پس ماندگی- رشوت- لوٹ مار اور قتل و غارت الغرض وہ کونسا عذاب ہے جو ان پر مسلط نہیں- ہمارے مذہبی کرم فرما ہی کچھ بتائیں کہ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر آخر کیوں؟ پوچھنے کی ضرورت نہیں- یہ سب مسلکی گروہ بندی اور تفرقہ کی کرشمہ سازی ہے جس نے اسلام کو دین (نظام) کے ٹریک سے اتار کر (مذہب (انفرادی نجات- پرستش) کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا ہے- یہ اپنوں کی عنائت ہو یا عجمی سازش- بہر صورت اسلام کو دنیا کے سب سے بڑے قلونچی سانحہ سے دوچار کرنے والے کسی معافی یا بخشش کے مستحق نہیں ہو سکتے-

آغاز سفر سے لیکر یہاں تک جو فاصلہ ہم نے طے کیا ہے اس میں فرقہ واریت کے تعارف اور اصلیت کی بات کی گئی ہے- جہاں تک اس کے تدارک یا خاتمے کا تعلق ہے- تو یہ ایک مشکل بلکہ پیچیدہ مسئلہ ہے اور کسی ایک کے سوچنے کا نہیں- جب تک سارے عالم اسلام کے بہی خواہ اور سکالر قسم کے لوگ مل کر نہیں بیٹھیں گے- بات نہیں بنے گی- فرقوں کا خاتمہ یا امت میں وحدت' بات ایک ہی

ہے اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ جس نظام کے گم ہو جانے سے فرقہ بندی شروع ہوئی تھی اس نظام کو پھر قائم کر دیا جائے۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ اس فکر کو عام کیا جائے کہ فرقوں کی موجودگی اور اسلامی زندگی دو متضاد چیزیں ہیں اور فرقوں کو مٹا کر اسلامی زندگی پیدا کرنے کا طریق خلافت علیٰ منہاج نبوت کے قیام کے سوا کوئی نہیں۔ مختلف فقہی مذاہب کے متعلق غور و فکر تو ٹکریں مارنے والی بات ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دور خلافت میں نہ کوئی اختلاف پیدا ہوا اور نہ کسی فرقے نے جنم لیا اور یہ وہ دور تھا جب بقول علامہ اقبال قرآن کریم کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔ (اقبال اور قرآن صفحہ 151) لا محالہ وحدت امت اور فرقہ واریت کی نفی کے سلسلہ میں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟۔

(1) قرآن نے اپنے نزول کا مقصد ہی یہ بتایا کہ وہ ان تمام اختلافات کو مٹا کر خدا کا دین قائم کرے گا اور فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک امت واحدہ میں تبدیل کر دے گا۔ فرمایا "(اے رسول) تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی گئی ہے کہ جن امور میں یہ لوگ باہمی اختلاف کرتے ہیں۔ تو ان کی وضاحت کر دے" (16/64)۔

(2) دین ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اس لئے الگ الگ 'دین' کے معنی یہ ہیں کہ اصل دین کہیں باقی نہیں رہا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "اے گروہ انبیاء! یہ تمہاری جماعت امت واحدہ ہے۔ تمہاری وجہ جامعیت یہ ہے کہ میں تم سب کا رب ہوں لہٰذا تم صرف میرے قوانین (وحی) کی نگہداشت کرنا"

(21/92, 23/52)۔ سورہ شوریٰ میں فرمایا "تم سب اسی دین کو قائم کرنا اور اس میں کسی قسم کا تفرقہ نہ پیدا کر دینا" (42/13)۔

(3) قرآن نے دین کو مکمل کر دیا اور اس کے بعد مسلمانوں سے کہہ دیا کہ تمہارا شعار زندگی اب یہ ہے کہ "تم سب کے سب مل کر اس ضابطہ خداوندی (قرآن) کو محکم طور پر تھامے رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ" (3/103)۔

(4) کسی نزاع یا اختلاف کی صورت میں ہمارے لئے کیا حکم ہے۔ فرمایا۔ "اے نبی جب یہ لوگ اپنے اختلافی امور کے فیصلہ کیلئے آپ کے پاس آئیں تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کیا کریں" (5/48)۔

قرآن کی ان وضاحتوں سے پتہ چلا کہ فرقہ بندی کو مٹانے اور امت کی وحدت کے قیام کے لئے قرآن ہی مشعل راہ ہے اور یہی اس کے نزول کا مقصد ہے۔ یقین رکھیں کہ کتاب اللہ کی طرف سے ہر فیصلہ جذبات اور مفاد خویشی سے بالا حقیقتاً ایک متفقہ فیصلہ ہو گا۔ فرمایا کہ "اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے" (4/82)۔ لہٰذا اس کی صداقت کی کسوٹی ایک یہ بھی ہے کہ اس میں کسی تضاد کا کوئی امکان نہیں۔

اب تک جو بیان ہوا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ فرقہ بندی ایک شرک ہے جو اسلام کی ضد ہے۔ یہ ایک ایسا مہلک مرض ہے۔ کہ جس میں اگر کوئی قوم مبتلا ہو جائے تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ اس کی تشخیص بھی خود خدا نے کی ہے اور علاج بھی اسی نے تجویز کیا ہے۔ یعنی کتاب اللہ کی طرف رجوع۔ (جو ہدایت و رحمت اور دل کی بیماریوں کیلئے شفا ہے۔) لیکن اگر مریض نہ صرف اس مرض میں مبتلا ہونے سے انکار کر دے بلکہ یہ دعویٰ بھی کر دے کہ میرے سوا اور کوئی تندرست ہے ہی نہیں تو وہ کبھی صحت یاب نہیں ہو سکتا۔ یہ مذہبی دنیا کی بہرحال پست ترین اور متشدد کیٹگری ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں ایک ایسا روشن خیال طبقہ بھی ہے۔ جو اس مذہبی گروہ بندی اور تفرقہ کو تو مہلک خیال کرتا ہے۔ لیکن معاذ اللہ کہتا یہ ہے قرآن میں اب اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ گروہی اختلافات مٹا سکے۔ اگر قرآن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے تو ہمیں سب سے پہلے اس خیال کو دماغ سے نکال دینا ہو گا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے بھی فرقے نہیں مٹ سکتے۔ یہ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ سچا اور اٹل ہے۔ یعنی اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اختلافات کو مٹا دے۔ لیکن اس حقیقت کو

سامنے رکھیں کہ فرقے صرف اسلامی نظام میں ہی مٹ سکتے ہیں اور اسلامی نظام کے معنی ہیں ایسی مملکت کا قیام جو ضابطہ خداوندی کے اصولوں کے تحت وجود میں آئے۔ اس مملکت میں جو قوانین نافذ ہوں گے ان کا اطلاق مملکت کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہو گا۔ اس میں نہ کوئی فرقہ ہو گا نہ کسی فرقہ کی الگ فقہ۔ لیکن قرائن بتا رہے ہیں کہ اس قسم کی مملکت کے قیام کے لئے موجودہ مسلمان کبھی راضی نہ ہوں گے۔ کیوں کہ یہ سب فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کوئی فرقہ اپنی فقہ کو چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔ اس سے آپ لا محالہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہم (موجودہ مسلمانوں) میں نہ ایسا نظام قائم ہو سکتا ہے۔ نہ فرقے مٹ سکتے ہیں۔

اس کا عملی مفہوم یہی ہے کہ اسلامی نظام اس قوم میں قائم ہو سکے گا جو مندرجہ بالا اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام لائے گی۔ خواہ وہ موجودہ مسلمانوں میں سے ہوں اور خواہ پہلی بار اسلام لائے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو بھی جو ایمان لانے کے لئے کہا ہے۔ تو اس سے یہی مراد ہے۔ ارشاد ہے۔

"اے مسلمانو! تم ایمان لاؤ اللہ پر' اس کے رسول پر' اور اس کتاب پر۔ جسے خدا نے اپنے رسول پر نازل کیا تھا" (4/136)

یہ از سر نو ایمان لانا درحقیقت فرقہ وارانہ زندگی کو خلاف اسلام تسلیم کر کے اسلامی نظام کے قیام کی طرف پیش رفت کے لئے قدم اٹھانا ہے۔

یہ مرحلہ بڑا دشوار گذار نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے سوا احیاء اسلام کی کوئی صورت نہیں اگر ہم اپنی موجودہ غیر اسلامی زندگی کو اسلامی کہہ کر اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں تو اس سے ہماری زندگی اسلامی نہیں ہو جائے گی۔ اسلامی زندگی کے لئے امت واحدہ (جس میں کوئی فرقہ نہ ہو) بنیادی شرط ہے۔

بہرحال مرحلہ دشوار سہی۔ ناممکن نہیں۔ آغاز سفر کے لئے کہیں سے تو ابتدا' کرنی ہی پڑے گی۔ پانی کے کسی تیز دھارے کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے درمیان میں بند لگانے کے بجائے ساری توجہ اس کے منبع پر مبذول کرنی پڑے گی۔ اس وقت ہمارے دارالعلوم فرقہ واریت کے لئے نرسری کا کام دے رہے ہیں کہ ان میں جداگانہ فقہی مسلکوں کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔

(1) ضرورت اس بات کی ہے کہ لکیر کے فقیر ہونے کے بجائے ہم اپنی درسگاہوں میں نئے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ایک جدید اور یونیفارم نصاب کا اجراء کریں جو مختلف فرقوں کی سوچ سے بالا ہو۔

(2) جہاں تک ممکن ہو نصاب کو اختلافی امور سے پاک رکھا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جامعات میں دینی اور دنیوی تعلیم کی ثنویت کو کلی طور پر ختم کر دیا جائے تاکہ دارلعلوم یا یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد طلباء دینی اور دنیوی لحاظ سے ایک صحت مند اور کامیاب شہری کا کردار ادا کر سکیں۔

(3) مختلف مکاتب فکر کے جید علماء کرام مل کر بیٹھیں اور پہلے قرآن و سنت کا ایک متفقہ مفہوم تیار کریں اور پھر قانون کے ماہرین اور سکالر نئے سرے سے ملک کا قانون مرتب کریں جس کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں طور پر ہو۔

(4) موجودہ دور الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے۔ اخبار۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی کچھ ایسے ذرائع ہیں جو روپے پیسے اور اقتدار سے زیادہ پاور فل ہیں۔ ان کے ذریعے فرقہ واریت کے روگ اور دین واحد کی برکات کے تقابل سے مسلمانوں کے دل و دماغ میں تبدیلی (تغیر نفس) لائی جا سکتی ہے۔

یہ تسلیم ہے۔ کہ موجودہ حالات میں مذہبی فرقہ بندی کو بہ یک جنبش قلم نہیں مٹایا جا سکتا۔ لیکن اگر بتدریج مناسب اقدام کیساتھ صحیح سمت پیش رفت جاری رہے تو فرقہ واریت کی گرہیں خود بخود ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور بنی نوع انسان کو وہ دن دیکھنا نصیب ہو جائے جب احیاء اسلام کا سورج اپنی ہزاروں شعاعوں کیساتھ طلوع ہو کر دنیا کی تاریک رات کو ایک بار پھر منور کر دے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بشیر احمد بشیر

یوم الفصل

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ حیات دنیا چند روزہ ہے۔ اس کو ہر حال میں ختم ہونا ہے۔

انساں اس چند روزہ حیات دنیا میں نیک و بد ہر طرح کے اعمال انجام دیتا رہتا ہے۔ اس کے اعمال کی جزا و سزا کا سلسلہ اگرچہ اسی دنیا میں شروع ہو جاتا ہے لیکن ابھی یہ مکمل نہیں ہو پاتا کہ موت اس کا کام تمام کر دیتی ہے۔

مرنے کے بعد انسان اگر نیست و نابود ہو جاتا تو اس کے اعمال کی بقایا سزا و جزا کا سلسلہ وہیں ختم ہو جاتا۔ لہٰذا عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ضروری تھا کہ موت کے بعد بھی حساب کتاب کا سلسلہ جاری رہتا۔ اللہ نے اس دوسرے دور کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے۔ کہیں اسے یوم الحساب کہا گیا ہے تو کہیں یوم الاخرۃ۔ کہیں اسے یوم القیامۃ کا نام دیا گیا ہے تو کہیں اسے یوم الفصل کہہ کر پکارا گیا ہے۔

ہم اس یوم الفصل کی کچھ تفصیل سورہ الدخان (44) کے حوالہ سے پیش کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

ان ھؤلاء لیقولون ○ ان ھی الا موتتنا الاولی وما نحن بمنشرین ○ فاتوا بآبآئنا ان کنتم صٰدقین ○ اھم خیر ام قوم تبع و الذین من قبلھم اھلکنٰھم انھم کانوا مجرمین ○ وما خلقنا السموت و الارض وما بینھما لٰعبین ○ ما خلقنٰھما الا بالحق ولٰکن اکثرھم لا یعلمون ○ ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین ○ یوم لا یغنی مولٰی عن مولٰی شیئا و لا ھم ینصرون ○ الا من رحم اللہ انہ ھو العزیز الرحیم ○ ان شجرت الزقوم ○ طعام الاَثِیم ○ کا لمھل یغلی فی البطون ○ کغلی الحمیم ○ خذوہ فاعتلوہ الٰی سواء الجحیم ○ ثم صبوا فوق راسہ من عذاب الحمیم ○ ذق انک انت العزیز الکریم ○ ان ھذا ما کنتم بہ تمترون ○ ان المتقین فی مقام امین ○ فی جنّٰت و عیون ○ یلبسون من سندس و استبرق متقٰبلین ○ کذٰلک و زوجنٰھم بحور عین ○ یدعون فیھا بکل فاکھۃ امنین ○ لا یذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الا ولی و وقٰھم عذاب الجحیم ○ فضلا من ربک ذلک ھو الفوز العظیم ○ فانما یسرنہ بلسانک لعلھم یتذکرون ○ فارتقب انھم مرتقبون ○

34- یہ وہ لوگ ہیں جو (بزعم خویش یہ بات) کہتے ہیں۔

35- کہ ہماری یہ پہلی موت ہی (دائمی اور مکمل) موت ہو گی اور ہم دوبارہ کبھی (زندہ ہو کر) اٹھنے والے نہیں ہیں۔

36- (اور کہتے ہیں کہ) اگر تم لوگ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو (کہ مر جانے کے بعد دوبارہ ضرور بالضرور زندہ ہونا ہے) تو ہمارے آباء و اجداد کو (زندہ کر کے ہمارے سامنے) لے آؤ (جو ہم سے قبل مر چکے ہیں)

37- (یوں یہ لوگ بڑی شیخیاں بگھار رہے ہیں کہ بس ہم ایک ہی دفعہ مرجائیں گے اور اپنے جرائم کی سزا سے بچ جائیں گے تو ان سے ذرا یہ تو پوچھا جائے کہ)

بھلا یہ لوگ اچھے اور بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور ان سے پہلے کے (بہت سے) لوگ تھے جن کو ہم نے ہلاک کر ڈالا کیونکہ وہ مجرم تھے۔ (اور دوبارہ یوم فصل کو بھی ان کے جرائم کی پوری پوری سزا دی جائے گی۔ اسی طرح سے ان لوگوں کو بھی دوبارہ ضرور زندہ کیا جائے گا اور ان کے جرائم کی ان کو پوری پوری سزا ملے گی۔)

38- اور ہم نے ان تمام آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ

ان دونوں کے مابین ہے محض کھیل تماشا کے طور پر تو تخلیق نہیں فرما دیا۔

-39 ہم نے تو ان دونوں کو بالحق (ایک خاص مقصد کی خاطر تخلیق فرمایا ہے۔ مگر ان لوگوں میں اکثر (اس حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔

-40 اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ یوم الفصل (فیصلے کا دن) ان سب کے لئے (دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کے لئے اکٹھا ہونے کا) مقرر کردہ وقت ہے۔

-41 یہ وہ دن ہو گا کہ جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آسکے گا۔ اور نہ ہی ان کو (کہیں سے) مدد مل سکے گی۔

-42 الا یہ کہ جس پر اللہ رحم فرما دے (تو ایسے لوگوں کو انشاء اللہ العزیز ضرور مدد مل سکے گی)

وہ (اللہ) یقیناً العزیز بھی ہے اور الرحیم بھی۔ (اس کی عزت و غلبہ کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اس کی رحمت بھی بے پایاں ہے)

-43 -44 ہاں تو مجرم اور گناہ گار شخص کا کھانا یقیناً تھوہر کا پودا ہو گا۔ (جو جہنم کے اسفل میں رکھا ہے (37/64) اور جس سے پیٹ کبھی نہ بھریں گے (37/66)

-45 -46 یہ پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہو گا جو پیٹوں میں ایسے کھولے گا جیسے گرم (ابلتا) پانی کھولتا ہے۔

-47 (پھر حکم دیا جائے گا کہ) اس کو پکڑ لو اور کھینچتے ہوئے جہنم کے بیچوں بیچ لے جاؤ۔

-48 پھر کھولتے ہوئے (پانی کا) عذاب اس کے سر پر انڈیل دو۔

-49 کہ اب چکھ (اس عذاب کا مزہ) تو بڑا عزیز اور کریم بنا پھرتا تھا۔ (اپنے آپ کو بڑی عزت و تکریم کا مالک گردانتا تھا)

-50 یہ (عذاب جہنم) وہی ہے جس کے بارے میں تم لوگ شک و شبہ میں مبتلا تھے۔

-51 (ان کے برعکس) جو متقی لوگ ہوں گے وہ امن کے مقام میں ہوں گے۔

-52 وہ باغات اور چشموں میں ہوں گے۔

-53 وہاں وہ باریک و دبیز ریشمی لباس میں ملبوس ایک دوسرے کے مقابلہ کے آسودہ جنتی لوگ ہوں گے۔

-54 یہ ہو گا ان کا خوش انجام اور روشن چشم (مصفّٰی دل و دماغ اور صاف ذہن و فطرت کے خوش اطوار لوگوں کے ساتھ ان کا میل ملاپ کرا دیں گے۔

-55 ان باغات میں وہ نہایت امن و اطمینان سے ہر قسم کے میوہ جات (کھانے کے لئے) منگوائیں گے۔

-56 ان باغات میں اب ان کو کبھی موت نہ آئے گی بس وہی پہلی موت تھی جس کا ذائقہ وہ چکھ چکے اور (اللہ) ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لے گا۔

-57 یہ (سب کچھ دراصل) تیرے رب کے فضل (و کرم) سے ہو گا اور یہی فوز و فلاح کی عظیم کامیابی ہے۔

-58 (یہ جو کچھ بتایا گیا ہے قرآن کریم کے توسط سے بتایا گیا ہے) اور ہم نے اس (قرآن کریم) کو آپؐ کی زبان مبارک کے ذریعے آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ (اس کو باسانی سمجھ سکیں اور) اس سے نصیحت حاصل کر سکیں۔

-59 (آپؐ نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ ان کو قرآن کریم نہایت آسان اور سہل طریقہ سے پڑھا دیا ہے اور سمجھا دیا۔ ان کے نیک و بد اعمال کے انجام سے ان کو بخوبی آگاہ فرما دیا) تو اب آپؐ بھی (یوم الفصل کے فیصلہ کا) انتظار فرمائیں اور یہ بھی انتظار کریں۔

—:—:—

ضرورت رشتہ

ایم اے بی ایڈ، عمر 26 سال، خوش قامت بیٹی کے لئے برسر روزگار موزوں زوج کی تلاش ہے۔

رابطہ چوہدری ممتاز معرفت طلوع اسلام ٹرسٹ

25 بی گلبرگ 2 لاہور۔ فون: 876219-879246

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد امین حیدر

آزادی افکار

دنیا کے تمام مذاہب میں ایک قدر مشترک نہایت اہم ہے جس کے بغیر کوئی مذہب، مذہب نہیں بنتا۔ وہ قدر مشترک یہ ہے کہ دنیا کا ہر مذہب سب سے پہلے عقل کے دیئے گل کرتا ہے۔ دنیا کے ہر مذہب نے "پہلا کارنامہ" یہی سرانجام دیا ہے کہ لوگوں کو راضی برضا اور تقدیر کا خوگر بنا دیا۔ مذہبی پیشوائیت کے فیصلوں پر تنقید تک کرنا جرم عظیم قرار دیا اور جہاں جہاں مذہب کے اجارہ داروں کا بس چل سکا، انہوں نے مذہب پر غور و فکر کرنے والوں کو سخت ترین سزائیں دیں۔ یہ بات ہر زمانہ پر لاگو ہوتی ہے خواہ وہ زمانہ قبل از مسیح کے یروشلم کا ہو، گلیلیو کے یونان یا خلیفہ ہارون الرشید کے عراق و شام کا۔

تاریخ کے ہر ورق پر مذہب کی عقل دشمنی کی شہادتیں اور نشانیاں بکھری پڑی ہیں۔ اسلام جب مذہبی پیشوائیت کے ہتھے چڑھا تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو باقی انبیاء کرام کی انقلابی تعلیمات کے ساتھ ہوا تھا۔ یعنی اسلام بھی رفتہ رفتہ ایک ترقی پذیر دین مردان خود آگاہ سے مذہب ملا و جمادات و نباتات میں تبدیل ہو گیا۔

لیکن تابہ کے۔ آخر کار گلیلیو اور سر سید جیسے مردان حر نے مذہبی پیشوائیت کی ان زنجیروں کو توڑنا شروع کر دیا اور یہ انہی باہمت لوگوں کے طفیل ہے کہ آج کا دور عمومی طور پر آزادئ فکر کا دور کہلاتا ہے۔ یورپ میں یہ دور مدت ہوئی شروع ہو چکا اور آج اپنے عروج پر ہے۔ مذہب کو گرجوں میں مقید کرنے کے بعد یورپ نے اپنی کشت زندگانی کی بار آوری کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں عقل کا سہارا لیا۔ ایشیا یورپ کی تقلید میں کم و بیش..... ڈیڑھ سو سال پیچھے رہا۔ چنانچہ تقریباً سو سال قبل یورپ مذہبی برگشتگی کے جس تجربہ سے گزرا ہم آج اسی تجربہ کے شکار ہیں۔ یہ ہے وہ پس منظر جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں آج اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر آج کی نوجوان نسل کا تجزیہ کرنیکی کوشش کروں گا۔

مذہب سے برگشتگی کوئی نئی چیز نہیں بلکہ ملا کا مذہب تو ہے ہی اس قابل کہ ہر عقل سلیم اس سے برگشتہ ہو جائے لیکن ہمارے ہاں ہوا یہ کہ عقل کو جب مذہبی پیشوائیت کے شکنجے سے آزادی ملی تو ایک دبے ہوئے سپرنگ کی طرح جسے اچانک رہا کر دیا جائے، عقل اپنی دوسری انتہا تک پہنچ گئی اور اس طرح پاکستان کی نئی نسل مکمل آزادئ فکر کے نعرہ سے روشناس ہوئی۔ اس کے بعد کسی بھی شے کو عقل سے بلند تصور کرنا انسانیت کی تذلیل ٹھہرا۔ چنانچہ یہاں بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ بقول لینن :-

عقل انسانی اس قابل ہے کہ یہ ہمیں صداقت مطلق کا علم دے سکے۔ چنانچہ اس نے (یعنی عقل نے) یہ علم دے دیا ہے۔

اور اس کے بعد دنیا بقول ہیگل ـــــ "سر کے بل کھڑی ہو گئی"

ہمارے نوجوانوں میں بھی مذہبی برگشتگی تعلیم کے ساتھ وباء کی طرح پھیلی۔ تعلیم نے نوجوانوں کو تجزیہ کرنے کی قوت دی اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے نظام نے نوجوانوں کو یورپ کی خود ساختہ انسانی اقدار اور شخصی آزادی کا سبق دیا۔ میرے مشاہدہ کے مطابق ان جدید اقدار کے نتیجہ میں پاکستانی نوجوانوں میں بنیادی طور پر دو طرح کا طرز فکر پیدا ہوا ہے۔ کچھ نوجوانوں نے یورپ سے انسانی آزادی کا سبق سیکھا اور اس سبق کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب انہوں نے مسلمانوں

کی مروجہ تاریخ کا مطالعہ کیا تو انہیں۔ بیشمار مسلمان خلفاء اور شیوخ کے حرم لونڈیوں اور غلاموں سے بھرپور نظر آئے اور یہ صورت حال آج بھی موجود ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

کچھ نوجوانوں نے یورپ سے مادہ پرستی (Materialism) کا سبق سیکھا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کا واحد مقصد تحفظ اور پرورش خویش کے سوا اور کوئی نہیں رہ گیا۔ ان کے معاشرتی تعلقات میں خالص کاروباری نقطہ نظر کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اور ان کا نظریہ حیات یہ بن گیا ہے کہ "زندگی یہی کچھ ہے۔ کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ"۔ اور مزے اڑانا آج کے نوجوان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

ہر پرانی چیز سے سرکشی آج کے نوجوان کی فطرت ہے۔ یہ اپنی ہی املاک کی توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ سب اس فکری بے راہ روی کا نتیجہ ہیں جس کا آج کی نوجوان نسل شکار ہے۔ نوجوانوں کی بے مقصد آزادی افکار کی حالت یہ ہے کہ آج کا نوجوان اتنی پابندی قبول کرنے پر بھی تیار نہیں کہ اسے سڑک کے بائیں طرف چلنا چاہئے۔ اسے سرخ ٹریفک سگنل پر رک جانا چاہئے۔ وہ ان تمام قواعد کو اپنی شہری اور شخصی آزادی کے خلاف گردانتے ہیں۔ آج نئی نسل ہر شے توڑنے پر تل گئی ہے خواہ وہ ٹریفک کا قانون ہو یا ضابطہ اخلاق' کارخانہ ہو یا کھلیان۔

آج کا نوجوان آزادی فکر و عمل پا کر بے حد خوش ہے۔ لیکن میرے مشاہدہ کے مطابق ہماری نوجوان نسل کا عقل اور جذبات کے مابین توازن بگڑ چکا ہے اور ہمارے نوجوانوں کی عقل کی حدود وہیں ختم ہو جاتی ہیں' جہاں ذاتی اور جذباتی خواہشات کی حدود ختم ہوتی ہیں۔ اگر میرے نوجوان ساتھی خود ہی کچھ مزید غور و فکر کی زحمت گوارا کریں تو ان پر واضح ہو کہ وہ ملا کی غلامی سے نکل کر اپنے نفس کی غلامی میں چلے گئے ہیں اور ان کے سرکش جذبات ہر مقام ہوش پر ان کی نام نہاد آزاد فکر کی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہیں۔

آزادی فکر بذات خود کوئی بری چیز نہیں۔ ہر چیز کا عقلی تجزیہ کرنا انسان کے انسان ہونے کا ثبوت ہے۔ غلط اور صحیح' اور اچھا اور برا میں امتیاز کر سکنے کی صلاحیت ہی امتیاز انسانیت ہے۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے سامنے جو کچھ پیش کیا جائے وہ اسے اختیار کرنے سے پہلے اس کا ہر پہلو سے جائزہ لے اور اسے ہر ممکن طریق پر پرکھے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک بات پیش نظر رکھنی ضروری ہے۔ انسانی معاشرہ میں ہر شخص کا عمل اور سوچ سارے سماج کو متاثر کرتی ہے۔ اگر انسانی معاشرہ میں ہر شخص الگ الگ صرف اپنے ہی فائدہ کے لئے سوچے اور اس پر عمل کرے تو معاشرہ کی ترقی یقیناً رک جائے گی۔ ایسے معاشرہ کی مثال ایک ایسے ڈبے کی سی ہو گی جس میں ہوا کے اربوں ذرات' اس معاشرہ کے افراد کی طرح' موجود ہوں۔ سائنس کی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان ذرات میں سے ہر ہر ذرہ مسلسل حرکت میں ہوتا ہے مگر مجموعی طور پر ڈبا اپنی جگہ ساکن رہتا ہے۔

آپ یقیناً اس بات سے اتفاق کریں گے کہ پاکستان کی نئی نسل کی فکری بے راہ روی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں اور راہنماؤں نے کبھی ذاتی مفادات سے بلند ہو کر قوم کے سامنے کوئی نصب العین رکھنے کی کوشش نہیں کی تاکہ ساری قوم مل جل کر ایک ہی سمت میں سوچ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی سوچ آج سمت سے مبرا ہے۔ میرے اکثر نوجوان ساتھی اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کے سامنے زندگی کا کوئی اجتماعی مقصد موجود نہیں جس کے متعلق وہ تعمیری طور پر سوچ سکیں۔

انفرادی طور پر بے مقصد آزادی فکر کی مثال ایک آوارہ گرد شخص کی سی ہے۔ بے لگام آزادی فکر ذہنی آوارہ گردی ہے۔ ایک آوارہ گرد چلتا ضرور ہے اور تھکتا بھی ہے مگر منزل اس سے اتنی ہی دور رہتی ہے جتنی دور آوارہ گردی شروع کرنے سے پہلے تھی۔ عین اسی طرح بغیر نصب العین کے آزادی فکر میں انسان سوچتا ضرور ہے اور توانائی بھی صرف کرتا ہے مگر منزل اس کے قریب ہونے کا نام

نہیں لیتی۔ اس کے مقابلہ میں بامقصد اور مثبت فکر کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کا ہر ہر قدم اسے منزل سے قریب سے قریب تر لے جاتا ہے۔ آزادی فکر کے بانتیجہ ہونے کیلئے لازمی ہے کہ غور و فکر کرنے والے کے سامنے ایک نشان منزل موجود ہو۔ تاکہ وہ شمع فکر کی روشنی میں راہ کی رکاوٹوں سے بچتا ہوا راہ منزل مقصود پر گامزن ہو سکے۔ جس راہی کے سامنے کوئی نشان منزل ہی نہ ہو اسے منزل کیسے مل سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم اور ہمارے راہ نما آزادی فکر کے ساتھ ساتھ ہماری نوجوان نسل کو نشان منزل بھی بتائیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کو بروئے کار لانے سے پاکستان کی نئی نسل کو فکری بے راہ روی سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ اور نئی نسل کی فکری بے راہ روی کو ختم کئے بغیر معاشرہ سے توڑ پھوڑ' اخلاق باختگی' اور لاقانونیت کا خاتمہ کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

(شاہد امین حیدر صاحب آپ کہاں ہیں؟ قارئین طلوع اسلام آپ کی تلاش میں ہیں۔ مدیر)

ملاح کی اصلاح!

ارے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کشتی میں چھید کیوں کرتے ہو؟

کشتی میں چھید کیوں کرتا ہوں؟ پچاس دفعہ اس ملاح سے کہہ چکا ہوں کہ تم نے بادبان غلط باندھا ہے۔ کشتی' سمت ساحل نہیں جارہی' اس کا رخ سیدھا کرو۔ لیکن یہ سنتا ہی نہیں۔ اب جو کشتی بیکار ہو گی تو پتہ چلے گا!

ارے پاگل! کشتی میں چھید کرو گے تو کشتی کے ساتھ خود بھی ڈوبو گے۔ ملاح کو تنبیہ کا یہ کونسا طریق ہے۔ اگر تم میں سے کوئی ناخدائی جانتا ہے تو ملاح کے ہاتھ سے چپو چھین لو اور کشتی کا رخ سیدھا کر دو۔ لیکن کشتی کو سلامت رکھو کہ اس کی سلامتی میں خود تمہاری سلامتی ہے۔

پاکستان کے موجودہ ارکان حکومت و اقتدار کی اصلاح کی فکر کرنے والوں کو ہر وقت یاد رکھنا چاہئے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جو خود مملکت پاکستان کی کمزوری کا باعث بن جائے کہ اس کشتی کے (خدا نکردہ) ڈوبنے سے ہم سب غرق ہو جائیں گے۔ ملاح غلط کار ہے تو اس کے ہاتھ سے چپو لے کر بہترین ہاتھوں میں دیدیجئے۔ لیکن کشتی میں چھید نہ کرنے بیٹھ جائے کہ دشمن ہر وقت گھات میں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

نظام ربوبیت کب قائم ہو گا؟

مجھ سے اکثر احباب پوچھتے رہتے ہیں (بالمشافہ بھی اور خطوط کے ذریعہ بھی) کہ نظام ربوبیت، جس کا تصور میں ایک عرصہ سے پیش کر رہا ہوں، وہ بالآخر کب قائم ہو گا؟ مجھے ان احباب کی بیتابی تمنا کا پورا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ معاشرہ کے حالات جس قدر خراب ہو چکے ہیں ان سے اس طبقہ پر کیا گذر رہی ہے جو پوری پوری محنت و مشقت اور سعی و کاوش کے باوجود، اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات زندگی پوری نہیں کر سکتے۔ ان کے حالات سنتا ہوں تو دل خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کی ان مصیبتوں کا علاج--- اتنا ہی نہیں بلکہ بے شمار خرابیوں کا علاج---

قرآنی نظام ربوبیت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ نظام انفرادی طور پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ملک کے وسائل پیداوار، تمام افراد کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے ملت کی اجتماعی تحویل میں ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انتظام، حکومت کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے میں پہلے دن سے، نہایت صراحت اور وضاحت سے پیش کیے چلا آرہا ہوں۔ اور اس کے لئے میرا اولیں مخاطب، برسر اقتدار طبقہ ہوتا ہے، کہ اگر بات ان کی سمجھ میں آجائے اور وہ اس قرآنی مشن کو پورا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو اس نظام کے قائم ہونے میں نہ دیر لگ سکتی ہے، نہ دقت پیش آسکتی ہے۔ ہمارا دور آئینی ہے اور مملکت کے نظام میں ہر تبدیلی آئینی طور پر ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے دوسری صورت یہ ہے کہ اس تصور کو ملک میں اس قدر عام کیا جائے کہ یہ جمہور کا تقاضا بن جائے اور وہ ایسے افراد کو اپنا نمائندہ منتخب کر کے مجالس قوانین ساز میں بھیجیں جو اس نظام خداوندی کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہوں اور اسے عملاً متشکل کرنے کا عزم لے کر ان مجالس میں جائیں۔ میں جو اس فکر کو، اپنی بساط کے مطابق عام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو اس سے یہی مقصد ہے۔

بعض احباب یہ تجویز لے کر آتے ہیں کہ جو لوگ اس تصور سے متفق ہیں وہ ایک محدود شکل میں اپنے طور پر اس نظام کو قائم کیوں نہیں کر لیتے۔ ان کی تجویز کا ملخص یہ ہوتا ہے کہ یہ احباب ایک چھوٹی سی بستی بسا لیں جس میں اس تصور کو عملی شکل دے کر اپنی زندگی اس نہج پر بسر کریں۔

یہ تجویز نئی نہیں۔ یہ برسوں سے میرے سامنے لائی جا رہی ہے اور متعدد بار اس پر غور و خوض ہو چکا ہے۔ اور اسے ناقابل عمل پایا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب آپ اس قسم کے انفرادی نظام کی آواز بلند کریں گے، اس پر لبیک کہنے والوں میں (زیادہ نہیں تو کم از کم) نوے فی صد (Have Nots) یعنی وہ لوگ ہوں گے جن کی آمدنی ان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کفایت نہیں کرتی۔ اور (شاید) دس فی صد لوگ ایسے ہوں جو اپنی ضروریات پوری کر سکیں یا جن کے پاس ضروریات سے کچھ زائد ہو۔ میں احباب کو مایوس نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا خیال ہے کہ میرا یہ اندازہ بھی کچھ خوش فہمی ہی پر مبنی ہے۔ جن کے پاس ضروریات سے زائد دولت ہو، وہ بہت کم ادھر آئیں گے۔ اب آپ سوچئے کہ جو نظام ان احباب پر مشتمل ہو گا جو اپنی کمائی سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوں، اور ایسے لوگ اس میں شامل ہوں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو وہ چل کیسے سکے گا؟

اس کے بعد ایک بڑی دشواری اور سامنے آتی ہے۔ اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ (زائد از ضروریات دولت رکھنے والے حضرات) کے افراد خاندان۔۔۔۔ ان کے بیوی بچے اور دیگر متعلقین۔۔۔۔ سب اس فکر سے متفق اور اس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے دلی تعاون کے بغیر یہ نظام ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک الگ جماعت قائم کرنا۔۔۔ چہ جائیکہ ایک الگ بستی بسانا۔۔۔۔ تو میری دعوت کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اسی سے فرقہ بندی کی ابتداء ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر اس تجویز کو نہ اس سے پہلے کبھی قابل عمل سمجھا گیا۔ اور نہ ہی اب در خور اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ نامساعدت حالات کے ہاتھوں پس جانے والے احباب کی بیتابی تمنا بجا اور درست۔ لیکن اس کا علاج پورے معاشرہ کے نظام میں تبدیلی کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے۔ ان مصیبت زدہ احباب کی داستان غم و الم سن کر جو کچھ میرے قلب حساس پر بیتتی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس سے میرے سینے میں بھی جذبات کے کچھ کم تلاطم انگیز طوفان نہیں اٹھتے۔ لیکن میں شدت جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا۔ (نہ ہی کسی کو ایسا قدم اٹھانے کا مشورہ دے سکتا ہوں) جس کا نتیجہ مایوسی اور افسردگی کے سوا کچھ نہ ہو۔

بعض حضرات یہ اعتراض بھی پیش کرتے ہیں کہ اس معاشی نظام کو قانون کے ذریعے نافذ کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو ایک خاص قسم کا نظام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ یہ نظام' اسلام کا تجویز کردہ ہے یا نہیں۔ اگر یہ اسلامی نظام نہیں تو اسے قانوناً" نافذ کرنا تو ایک طرف' اگر مسلمان اسے ۔طیب خاطر بھی اپنے ہاں رائج کرنا چاہیں تو ان کا یہ اقدام سراسر غلط ہو گا اور ایک اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اس کی روک تھام کرے۔

لیکن اگر یہ نظام' اسلام کے مطابق ہے' تو پھر اس کا قانوناً" نافذ کرنا مسلمانوں پر جبر کرنے کے مرادف نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ ۔طیب خاطر اس کا اقرار کرتا ہے کہ وہ ہر اسلامی فیصلہ کو قبول اور اختیار کرے گا۔ مثلاً شراب (خمر) کا استعمال اسلام میں ممنوع ہے۔ اگر حکومت' اس کا استعمال از روئے قانون ناجائز قرار دیدے" تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ حکومت نے ان مسلمانوں پر جبر کیا ہے جو شراب نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قرآنی فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تو اس کے لئے یہ راستہ کھلا ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔

لہٰذا' قرآن کے معاشی نظام کا' قانون کی رو سے نفاذ' مسلمانوں پر جبر نہیں کہلا سکتا۔ (ایسے ہی جیسے کسی کمیونسٹ پر کمیونزم کے معاشی نظام کا قانوناً" نفاذ' جبر نہیں کہلا سکتا)۔ میری کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں پر اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ نظام ربوبیت' قرآن کریم کا تجویز کردہ نظام ہے اور اس کا اپنے ہاں رائج کرنا عین اسلام کا تقاضا۔

اس سلسلہ میں' میں اتنا اور عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دعوت صرف نظام ربوبیت کا قیام نہیں۔ یہ تو اس دعوت کا ایک گوشہ ہے۔ میری دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اسلام' جو خدا کے عطا کردہ دین کے بجائے' انسانی ذہنوں کا تراشیدہ مذہب بن کر رہ گیا ہے' اسے پھر سے اس کی اصلی اور حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے' اور اس طرح قرآن کی شمع آسمانی کو' جس پر انسانوں کے خود ساختہ تصورات۔ معتقدات اور رسوم و رواج کے دبیز پردے پڑ چکے ہیں' پھر سے وجہ تابانی محفل انسانیت بنایا جائے۔ اگر دین اپنی حقیقی شکل میں مسلمانوں کے سامنے آجائے تو پھر نظام ربوبیت کا قیام اس کا فطری

نتیجہ ہو گا۔ اس وقت اس کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے خود ساختہ "مذہب" کا وجود ہے۔ یہ ہے میری بنیادی دعوت اور یہ ہے میری تمام کوششوں کا منتہی و مقصود۔ اس سے نہ صرف ہمارے نظام معیشت میں تبدیلی آئے گی بلکہ زندگی کا ہر گوشہ خوشگوار آسمانی انقلاب سے ہم آغوش ہو گا۔ جس سے پھر وہ انسانیت ساز فضا وجہ برومندی دل و دماغ ہو گی جو ایک بار' سرزمین حجاز میں' **محمد رسول اللہ والذین معہ**' کے مقدس ہاتھوں آئینہ پوش ہوئی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کیلئے انسانیت کی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ للہ الحمد کہ اس باب میں مجھے جو کامیابی ہوئی ہے وہ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میں جب اس فضا پر نگاہ ڈالتا ہوں' اور اس کے بعد یہ دیکھتا ہوں کہ آج کس طرح ملک کے گوشے گوشے تک یہ آواز پہنچ چکی ہے اور اس نے کس طرح فضا میں ایک خوشگوار ارتعاش اور امید افزا تحرک پیدا کر دیا ہے' تو میرا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں' مستانہ وار جھک جاتا ہے۔

(مارچ 1965ء _ باضافہ ستمبر 1967ء)

حقائق و عبر

"جن اور نمل"

ماہنامہ اشراق لاہور نے شمارہ جولائی 1995ء میں جناب خورشید احمد ندیم صاحب کا مضمون (پرویز صاحب کی اصل غلطی) دوبارہ شائع کیا ہے۔ جواب میں ہم پہلے ہی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ مضمون میں لفظ "جن" اور "نمل" قابل ذکر ہیں۔

محترم خورشید احمد ندیم صاحب 'جن' سے مراد روائتی 'جن' بصورت الگ مخلوق اور لفظ 'نمل' کو حقیقی معنوں میں بطور "چیونٹی" لیتے ہیں جبکہ پرویز صاحب نے وادی نمل کو انسانوں کی وادی سمجھا ہے اور نملہ کو اس وادی میں رہنے والوں کی سربراہ کہا ہے۔ 'جن' کے موضوع پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہ ویسے بھی کوئی قومی مسئلہ نہیں کہ اس پر مزید صفحات سیاہ کئے جائیں۔

مشکل یہ ہے کہ عربی زبان کا سطحی علم رکھنے والے حضرات نہ قرآن کریم کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ پاتے ہیں نہ پرویز کو سمجھنا ان کے بس کی بات ہے۔ پرویز صاحب نے خود کو ہمیشہ قرآن کریم کا طالب علم کہا ہے۔ ان کی علمی سطح کے لوگ ان سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن وہ کبھی بھی انہیں غلط نہیں کہیں گے۔

حضرت سلیمانؑ کے دور کی کوئی مستند تاریخ بجز قرآن ہمارے پاس موجود نہیں' کہ ہم جناب خورشید احمد ندیم صاحب کو لفظ "نمل" کا مستعمل سمجھا سکیں۔ ہاں البتہ نوشہرہ چھاؤنی میں آج بھی ایک بہت بڑا بورڈ آویزاں ہے جس پر لکھا ہے

"HOME OF SCORPIONS"

اللہ اکبر

ندیم صاحب چاہیں تو اس کا ترجمہ "بچھو گھر" کر لیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ پاک فوج کی ایک بٹالین کا مسکن ہے۔ Scorpion جس کا عام ترجمہ بچھو یا عقرب ہی کیا جائیگا' اس بٹالین کا مجازی نام ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

نام کتاب :- کتاب عظیم دو جلدوں میں
:- قرآنی آیات موضوعات کی ترتیب میں
مرتب :- مشتاق عظیم
شائع کردہ :- قرآن مرکز پوسٹ بکس 1278 اسلام آباد
ملنے کا پتہ :- دوست ایسوسی ایٹس الکریم مارکیٹ' اردو بازار' لاہور
قیمت :- مجلد لیکسین فی جلد 250 روپے

کتاب زیر تبصرہ قرآن مجید کی تعلیمات کو ایک نئے اسلوب سے سمجھانے کی قابل قدر کوشش ہے۔ قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ اگر اس کے ماننے والے سچے دل سے اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔ تو وہ دنیا کی قوموں کی امامت کے حقدار ہوں گے۔ قرن اول کے مسلمانوں نے ان تعلیمات پر عمل کر کے یہ مقام حاصل کیا تھا' لیکن بعد میں مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کو بے جان مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں سے قوموں کی امامت کا منصب چھین لیا گیا اور اسلامی معاشرہ صراط مستقیم کی پٹڑی سے اتر کر جہالت اور گمراہی کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ بلاشبہ آج بھی مسلمانوں کی اکثریت قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے کو دعویدار ہے۔ لیکن چونکہ وہ ان تعلیمات کی اصل روح سے بے خبر ہے۔ اس لئے مسلمان دنیا کی قوموں میں اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

سب سے پہلے تو مصنف' مسلمانوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں' جو تلاوت قرآن مجید سے صرف اس کا پڑھنا مراد لیتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا سچ ہے کہ کسی کتاب کا محض پڑھ لینا تلاوت نہیں کہلاتا۔ تلاوت کے بنیادی معنی اتباع اور پیروی کے ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید کو اس لئے پڑھا جائے کہ اس کی تعلیمات کو سمجھا جائے اور پھر ان پر عمل کیا جائے۔

قرآنی تعلیمات کے جتنے موضوع ہو سکتے ہیں' مصنف نے ان کے تحت متعلقہ آیات جمع کر دی ہیں۔ پہلے متعلقہ موضوع کا مختصر مگر جامع تعارف بھی پیش کر دیا ہے۔ مصنف نے کتاب کے شروع میں ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کی تالیف میں انہوں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا ابوالکلام آزاد' حضرت شاہ عبدالقادر' ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ غلام احمد پرویز کی قرآنی تعلیمات کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ استفادہ آنکھیں بند کر کے نہیں کیا بلکہ آنکھیں کھول کر کیا ہے۔ مثلاً اردو زبان میں قرآن مجید کی تفسیریں لکھنے والے اکثر علماء نے سورۃ البقرہ کی آیت 30 کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ مودودی صاحب نے تو اپنی جماعت یعنی جماعت اسلامی کی بنیاد ہی اس نظریے پر اٹھائی ہے۔ وہ اپنے کتابچے اسلام کا سیاسی نقطہ نظر' میں فرماتے ہیں کہ انسان چونکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ ہے اس لئے یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہاں پر اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ کرے۔ حالانکہ علمائے اسلام نے اس عقیدے کو غلط اور کفر قرار دیا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے تو اسے کفر سے بھی زیادہ سنگین گناہ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ان کی کتاب الفتاویٰ الکبریٰ جلد دوم ص 553) اس وضاحت کی روشنی میں

تو یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی بنیاد کفر پر اٹھائی ہے۔

مصنف اس غلط عقیدے کی تردید کرتے ہیں کہ انی جاعل فی الارض خلفیہ سے مراد یہ نہیں کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کا خلفیہ یا جانشین نہیں کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ تو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے لہٰذا اسے کسی نائب، جانشین یا خلیفہ کی ضرورت نہیں ہے۔ (صفحہ 241)

مصنف کہتے ہیں کہ آج بھی اگر مسلمان قرآن مجید کی تعلیمات کو سمجھ کر اس پر صدق دل سے عمل شروع کر دیں تو وہ دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی یہ کوشش اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کی تائید میں وہ کتاب کا خاتمہ قرآن مجید ہی کے اس مضمون کی آیات سے کرتے ہیں جن کا ترجمہ یوں ہے :-

"میرے ان بندوں سے کہو ! جنہوں نے قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں انہیں ان کی غلط روش کے مضر اثرات سے اللہ تعالیٰ کے نظام کا تحفظ پھر سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور حفاظتوں کی آغوش تو کھلی ہے۔ لہٰذا پلٹ آؤ اپنے پروردگار کے نظام کی طرف اور اس کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دو۔ قبل اس کے کہ مہلت کا وقفہ ختم ہو کر ظہور نتائج کا وقت آجائے اور پھر تمہارے لئے تباہی اور عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہ رہے۔" (39/54-53) (جلد دوم صفحہ 503)

کتاب بڑی محنت سے آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ ایک عام لکھا پڑھا آدمی اس کی مدد سے قرآنی تعلیمات کا علم حاصل کر سکتا ہے اور پھر ان تعلیمات پر عمل کر کے اپنی زندگی کو سنوار سکتا ہے۔ مصنف کی کوشش قابل داد ہے اور ہر طرح سے اس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔

رفیع اللہ شہاب

موضوعات -- کنونشن کے لئے

1- اساس پاکستان خطرے میں؟
2- ہماری معاشی بیماریوں کا علاج؟
3- تعلیم سے کیا حاصل؟
4- کیا عورتیں بھی انسان ہیں؟
5- حفاظت جان و مال ہمارا بنیادی حق؟
6- فرقہ پرستی کا انسداد۔ قرآن کی روشنی میں

موضوعات -- بزم مذاکرہ کے لئے

1- میں نے قرآن سے اب تک کیا سیکھا؟
2- قرآن خالص کی تعلیم کیوں عام نہیں ہو رہی؟
3- ہم اپنی روز مرہ زندگی میں قرآن کریم کو اس کا جائز مقام کیوں نہیں دیتے؟
4- قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں؟
5- مغرب کی ثقافتی یلغار (بالخصوص) فحاشی کا مقابلہ قرآنی حوالہ سے۔
6- ہمارے نظام تعلیم کی خرابیاں اور اصلاح کے طریقے قرآن کی روشنی میں۔
7- عورتیں بھی انسان ہیں !
8- Population Explosion and its Quranic Solution

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صابر صدیقی

مختلف اقوام کے عقیدہ ہائے تخلیق کائنات

ہمیں آج دنیا میں قسم قسم کے مذاہب اور مسالک نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ تو سرے سے خدا تعالیٰ کے وجود ہی کو نہیں مانتے اور اس کی ہستی سے انکار کرتے ہیں اور جو مانتے بھی ہیں وہ اپنے ذہن میں اس کا ایک تصور گھڑ لیتے ہیں۔ کوئی دو خداؤں کو مانتا ہے اور کوئی تین کو۔ ہندوؤں کا ذوق صنم پرستی اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ انہوں نے کروڑوں دیوتا تراش لیے ہیں لیکن بنی نوع انسان کی ابتدائی زندگی میں صرف ایک خدائے واحد کا تصور تھا جسے بعد میں یہودیت اور سلام نے پیش کیا۔ یہی تصور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دیا تھا' لیکن عیسائیوں نے اپنے لئے اقنوم ثلاثہ کا عقیدہ وضع کر لیا۔ "پروفیسر شمٹ (Schmidt) کی تحقیق کے مطابق خدا تعالیٰ کی پرستش کا جو تصور بلند مذاہب نے پیش کیا ہے' یہ کوئی نیا تصور نہیں جسے انہوں نے ایجاد کیا ہو۔ نوع انسان کا قدیم ترین مذہب یہی تھا جس کا احیاء بلند مذاہب نے کیا ہے"۔ 1

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابتداء میں انسان ایک واحد خالق کائنات کا تصور اپنے ذہن میں رکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہی اس کارگاہ ہستی کا نظم و نسق چلا رہا ہے لیکن بعد میں محسوسات کے خوگر انسان نے ایک محسوس خدا کو دیکھنے کی تمنا سے مجبور ہو کر صنم تراشی شروع کر لی اور اپنے ذوق اور حالات کے مطابق تخلیق کائنات کے افسانے گھڑ لئے۔ اگر ہم مختلف اقوام کی دیو مالائی کہانیوں کا مطالعہ کریں تو تمام اختلافات کے باوجود ہم ان میں تخلیق کائنات کا عقیدہ مشترک پاتے ہیں یعنی یہ کہ کائنات قدیم نہیں اور نہ ہی یہ خود بخود وجود پذیر ہوئی ہے' بلکہ اسے کسی بلند و بالا ہستی نے پیدا کیا ہے جو عزیز و قدیر ہے۔ تخلیق کائنات کے مختلف مراحل اور ان کی جزئیات سے قطع نظر قدیم مذاہب کے پیرو اور ہندو' مسلمان' یہودی' عیسائی' اور پارسی سبھی اس نقطہ پر متفق نظر آتے ہیں۔

بابل کی تہذیب دنیا کی سب سے پرانی تہذیب تھی۔ ماہرین آثار قدیمہ نے بابلی تہذیب کے پرانے شہروں کی کھدائی کے دوران جو لوحیں دریافت کی ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بابل تخلیق کائنات کے عقیدے پر یقین رکھتے تھے۔ ان لوحوں پر کندہ داستانوں سے معلوم ہوا ہے کہ بابلیوں کے نزدیک جب کائنات موجود نہ تھی' نہ آسمان تھا اور نہ زمین تو نمکین اور میٹھے پانی کے ملاپ سے زمین و آسمان وجود میں آئے۔ اسی سے کئی مختلف دیوتا بھی پیدا ہوئے اور اسی پانی سے لحمو (نر) اور لحامو (مادہ) کی بھی پیدائش ہوئی۔ اسی پانی سے عرش بنا اور اسی پانی سے مروک دیوتا (سورج) بھی پیدا ہوا' جو بابل کا سب سے عظیم اور صاحب قوت دیوتا مانا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کائنات کی کوئی چیز بھی اس کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتی۔ مروک ہی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے علاوہ اس نے تین سو دیوتا آسمان پر اور تین سو دیوتا زمین پر مامور کئے۔ انہی زمینی دیوتاؤں نے اہل بابل کے لئے بابل کا شہر تعمیر کیا۔ ایک روایت کے مطابق مروک دیوتا کی چار آنکھیں' چار ہاتھ اور چار کان تھے۔ وہ جب منہ کھولتا تھا تو اس کے منہ سے شعلے نکلتے تھے۔ وہ قدوقامت میں سب دیوتاؤں سے بڑا تھا' لیکن اسی اثناء میں دیوتاؤں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ مروک نے تیامت دیوی کے سیپ کی طرح دو ٹکڑے کر دیئے۔ جس کے بالائی حصہ سے آسمان بنا اور زیریں حصہ سے زمین۔ اس نے آسمان پر چوکیدار مقرر کر دیئے تاکہ آسمان کا

پانی زمین پر نہ گرے۔ مردک نے عرش کا مسکن آسمان پر اور زمین کا مسکن پانی کی گہرائیوں میں قائم کیا اور ہوا کو دیوتا ان لیل کا مسکن تجویز کیا۔ اس کے بعد مردک نے دیوتاؤں کو ستاروں کی بلندی پر بٹھا کر سال کا تعین کر کے اور اس کے بارہ مہینے بنا کر انہیں دنوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر چاندنی کو روشنی دے کر رات کے سپرد کر دیا اور حکم دیا کہ چاند کو ہر ماہ نیا تاج پہنایا جائے۔ اس کے بعد مردک نے اپنے جال سے آسمان پر ستاروں کا جال بچھا کر اپنے تیر سے کہکشاں بنائی اور جب وہ فارغ ہوا تو اس نے زمین سے کہا کہ وہ ہڈیوں کو جوڑ کر اور خون پیدا کر کے ایسے وحشی درندے کی تخلیق کرے گا جس کا نام آدمی ہو گا۔ یہ جاہل اور وحشی درندہ دیوتاؤں کی خدمت کرے گا۔ پھر مردک نے ایک باغی اور مفسد دیوتا کو پکڑ کر اس کی شہ رگ کاٹ دی اور اس کے خون سے انسان کی تخلیق کی۔ پھر دیوتاؤں نے مردک کے لئے ایک معبد تیار کیا جو شہر بابل کی سب عمارتوں سے اونچا تھا۔ جب مردک اس میں رونق افروز ہوا تو اس نے اعلان کیا کہ شہر بابل تمہارا گھر ہے تم یہاں آرام سے رہو۔

عراقی تہذیبوں کی طرح مصری تہذیب بھی بہت قدیم ہے' جو سرزمین مصر میں تین ہزار سال تک قائم رہی۔ مصری تہذیب میں تخلیق کائنات کے متعلق کئی داستانیں مروج تھیں' جن کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے دیوتا پتاح تھا' یعنی پانی سے پیدا ہونے والی زمین۔ اس دیوتا کا دوسرا نام انوم بھی تھا' وہ دریائے نیل کے ڈیلٹے کے ایک ٹیلے پر مقیم تھا۔ اس کے تھوک سے ہوا اور اس کی چھینک سے نمی کی دیوی طفونت پیدا ہوئی' جو شو کی بیوی تھی' شو اور طفونت کے اتصال سے زمین کا دیوتا گیپ اور آسمان کی دیوی نوط پیدا ہوئی۔ ایک اور داستان کے مطابق ابتداء میں پانی ہی پانی تھا۔ اس میں ایک انڈا یا کنول کا پھول نمودار ہوا جو مدت تک پانی میں تیرتا رہا۔ اس میں سے انوم نکلا اور اس کی چار اولادیں' شو' گیپ' طفونت اور نوط پیدا ہوئیں۔ پھر شو اور طفونت نے اپنے آپ کو گیپ اور نوط کے اندر داخل کر دیا اور گیپ کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر نوط کو اونچا کر دیا۔ اس طرح زمین و آسمان جو پہلے ملحق تھے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ایک اور داستان کے مطابق پتاح عرش عظیم پر بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی نونت نے انوم کو جنا۔ پتاح نے تمام دیوتاؤں کو پیدا کیا جو دل اور زبان کی صورت میں وجود میں آئے۔ اس نے دل کے ارادے سے انوم کو پیدا کیا۔ وہ ہر جگہ موجود ہے' دیوتاؤں میں بھی اور مویشیوں اور کیڑے مکوڑوں میں بھی۔ وہ جو چاہتا ہے سوچتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ اسی نے شو اور طفونت اور تمام ذی حیات مخلوق کو پیدا کیا اور تمام اشیاء کی تخلیق کے بعد اس نے آرام کیا۔ ایک اور داستان کے مطابق آمون راع (سورج) مصریوں کا سب سے بڑا دیوتا ہے۔ اس کی کشتی دن کے وقت آسمان کے سمندر سے گذرتی ہے اور رات کو ظلمات کے سمندر میں جاتی ہے' جہاں آمون راع کا دشمن اژدہا ابو فیس رہتا ہے۔ اس داستان کے مطابق آقائے کل نے وجود میں آنے کے بعد کہا کہ میں وہ ہوں۔ جو گوبر کے کیڑے کی شکل میں وجود میں آیا اور جب میں وجود میں آیا تو ہستی کا وجود ہوا اور تمام اشیاء نے وجود پایا۔ آسمان زمین اور دوسری مخلوقات کو وجود میں لانے سے پہلے میں نے کچھ کو پانی میں عالم بے ہوشی میں رکھا اور عالم تنہائی میں ہر شے کی شکل اپنے تصور میں مقرر کی۔ پھر بہ کثرت موجودات کے پیکر بنائے۔ پھر میں نے شو کو اپنے تھوک سے اور طفونت کو اپنی چھینک سے پیدا کیا۔ پھر گیپ اور نوط سے دوسرے دیوتا پیدا کئے تاکہ ان کی مدد سے ابو فیس اژدہا کو ہلاک کیا جائے' جو ہلاک ہوا اور اس کا نام و نشان مٹ گیا۔

چینی تہذیب کا عہد زریں "چو" خاندان کا دور حکومت سمجھا جاتا ہے جو 1527ء قبل مسیح سے 221 قبل مسیح تک قائم رہا۔ لاؤزے اور کنفیوشش اسی دور میں پیدا ہوئے اور اسی دور میں چین کا فلسفیانہ ادب بھی تحریر ہوا۔ چینی قوم کے نزدیک ابتری اور فساد میں نظم و ضبط پیدا کرنے کا نام تخلیق تھا۔ چنانچہ ان کی ایک داستان کے مطابق شمالی سمندر

میں "ہو" کا اور جنوبی سمندر میں "شو" کا راج تھا اور ان دونوں کے درمیان سمندر ہی میں ہون تون حکومت کرتا تھا اور ہو اور شو دونوں ہون تون کے علاقے میں ملاقات کیا کرتے تھے۔ ہون تون معذور ہونے کے باوجود بڑا مہمان نواز تھا۔ ہو اور شو نے اس کا علاج کیا لیکن وہ نہ بچ سکا۔ چینی زبان میں ہون تون فساد کو کہتے ہیں۔ ہون تون کے مرتے ہی کائنات وجود میں آگئی۔ مرکب ہو شو کا مطلب بجلی کی کڑک اور چمک ہے۔ گویا کائنات کی تخلیق بجی کی کڑک اور چمک سے ہوئی۔ ایک اور چینی داستان کے مطابق ہون تون یعنی فساد پہلے مرغی کے انڈے کی طرح تھا جس میں "پان کو" پرورش پا رہا تھا۔ اٹھارہ ہزار برس کے بعد یہ انڈا پھوٹا اور اس میں سے نکلنے والا ہلکا چمکیلا حصہ آسمان اور تاریک اور وزنی حصہ زمین بن گیا۔ پھر اور اٹھارہ ہزار برس تک آسمان ہر روز دس فٹ تک بلند ہوتا گیا اور زمین ہر روز دس فٹ موٹی ہوتی گئی اور ساتھ ہی "پان کو" بھی دس فٹ بڑھتا گیا۔ اب زمین اور آسمان کے درمیان تیس ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ کچھ عرصہ بعد "پان کو" مر گیا اور اس کے جسم کے مختلف حصے قدرتی عناصر میں تبدیل ہو گئے۔ اس کا سر پہاڑ بن گیا۔ اس کی دائیں آنکھ سورج اور بائیں آنکھ چاند بن گئی اس کا سانس ہوا اور بادل میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی آواز نے بادل کی گرج اور چمک اختیار کر لی۔ اس کے خون سے سمندر اور دریا بنے اور اس کے رگ پٹھے زمین کی تہوں کی شکل میں ڈھل گئے۔ اس کے گوشت سے ہریالی پیدا ہوئی اور بالوں سے ستارے اور سیارے بنے۔ اس کی ہڈیوں اور دانتوں سے مختلف دھاتیں بنیں۔ اس کا پسینہ بارش بن گیا اور اس کے جسم سے چمٹی ہوئی جوئوں سے نسل انسانی وجود میں آئی۔ ایک اور داستان کے مطابق زمین اور آسمان الگ ہو جانے کے بعد "نوکوا" دیوی نے پیلی مٹی سے رئیسوں اور امیروں کو اور کیچڑ سے غریب عوام کو بنایا۔ ایک اور داستان میں بتایا گیا ہے کہ "پان کو" کائنات اور اس میں موجود جمادات، حیوانات اور نباتات کو بنانے کے بعد بھی مطمئن نہ تھا اور کوئی ایسی مخلوق بنانا چاہتا تھا جو استدلال کی قوت رکھتی ہو اور جو زمین کی ترقی کا موجب ہو۔ لہٰذا اس نے مردوں اور عورتوں کے مٹی کے پتلے بنائے، جونہی وہ پتلے خشک ہوئے تو ان میں ین (YIN) اور یانگ (Yang) پیدا ہو گئی۔ ین اور یانگ چینی فکر میں کائنات کا حرکی اور تخلیقی اصول ہے جن کے باہمی تصادم اور توافق سے کائنات اور اشیائے کائنات میں تغیر و تبدل واقع ہوتا رہتا ہے اور ان کے وصل و فراق سے تمام واقعات ظہور میں آتے ہیں۔ اس سارے، عمل میں یانگ فاعل ہے اور ین مفعول۔ یانگ مثبت قوت ہے اور ین منفی۔ یانگ نر ہے اور ین مادہ۔ یانگ آسمان ہے جو بلند و بال ہے اور ین زمین ہے جو پست ہے۔ اسی طرح متعدد اشیاء و تصورات مثلاً سفیدی اور سیاہی، نرمی اور سختی، غم اور خوشی، نیکی اور بدی، چھوٹائی اور بڑائی، اتفاق اور اختلاف، دوستی اور دشمنی، رد اور قبول، سزا اور جزا، محبت اور نفرت، اقدام اور پسپائی، جفت اور طاق، بلندی اور پستی وغیرہ، یہ سب یانگ اور ین کے باہمی رشتوں کے مختلف مظاہر ہیں اور ان میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا تصور محال ہے۔

آریہ لوگ وسطی ایشیا کے باشندے بتائے جاتے ہیں جو ایک ہزار سال قبل مسیح سے بھی پہلے وادی سندھ میں وارد ہوئے اور یہیں ان کی مقدس کتاب رگ وید مرتب ہوئی۔ وادی سندھ میں انہیں مقامی باشندوں کی مزاحمت سے دو چار ہونا پڑا۔ رگ وید کے مطابق مقامی لوگوں کے دو سردار 'اوتیا' اور 'دوتر' آپس میں برسر پیکار تھے۔ جب آزادی کا بیٹا 'اوتیا' ہارنے لگا تو اس نے دھرتی اور آکاش کے بیٹے 'اندر' سے مدد کی درخواست کی۔ اندر نے دھرتی کے سینے سے نکلنے والا سوم رس پیا تو اس میں اتنی طاقت آگئی کہ آکاش جو پہلے دھرتی کے ساتھ جڑا ہوا تھا، خوف کے مارے اوپر چلا گیا اور فضاؤں میں 'اندر' کا راج ہو گیا۔ جب وہ بجلی کا بھالا لے کر درتر سے لڑنے کے لئے نکلا تو اس نے اژدھے کا روپ دھار لیا۔ لیکن اندر نے ایک ہی وار میں اژدھے کا پیٹ پھاڑ دیا۔ اژدھے کا پیٹ پھٹتے ہی اس میں سے ایک حاملہ گائے

نکلی' جس نے سورج کو جنم دیا- جب ست (ہستی_ وجود) است (نیستی_ عدم) سے پیدا ہوا تو سورج نے آسمان پر اپنا راستہ بنایا اور پانی نے بھی آکاش کی راہ لی' اور آسمان سے پانی کی پھوار برسنا شروع ہو گئی- اس وقت ہر چیز کی ایک ریت مقرر ہوئی اور اندر نے دوسرے دیوتاؤں کے ساتھ مل کر تخلیق کا جشن منایا اور پہلا انسان وجود میں آیا- رگ وید کی ایک دوسری کہانی میں ہے کہ ہرنیائے گربھ (انڈا) سب سے پہلے نمودار ہوا' جو پانی پر ادھر ادھر تیرتا پھرتا تھا اور وہی کائنات کا مالک اور آقا تھا- اس نے آسمان کو بلندی دی اور زمین کو ٹھوس بنایا- نرائن ایک ہزار سال تک اس انڈے پر لیٹا رہا- پھر اس کی ناف سے کنول کا ایک پھول نکلا جو ہزاروں سورجوں سے زیادہ روشن تھا اور اتنا بڑا تھا کہ ساری کائنات اس میں سما سکتی تھی- اس پھول سے برہما پیدا ہوا جس میں نرائن کی طاقت تھی- برہما نے دنیا کی تمام چیزیں پیدا کیں- ابتداء میں پوری کائنات برہما تھی- اس نے باقی دیوتاؤں کو پیدا کیا- اگنی کو 'زمین' وایو (ہوا) کو فضا اور سوریہ (سورج) کو آسمان دے کر خود کائنات سے باہر چلا گیا- وہی دانائے کل اور قادر مطلق ہے- رگ وید کے ایک بھجن کے مطابق پرش نامی ایک دیوتا تھا' جس کے ایک ہزار سر' ایک ہزار آنکھیں اور ایک ہزار پاؤں تھے- اس نے زمین کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا- دیوتاؤں نے اس کی قربانی دے کر اس کے وجود کی ایک چوتھائی سے کائنات بنائی اور باقی تین چوتھائی آسمان پر امر ہے- جب دیوتاؤں نے پرش کے ٹکڑے کئے تو اس کے منہ سے برہمن بنا- اس کے بازوؤں سے چھتری' اس کی رانوں سے ویش اور پاؤں سے شودر بنے- اس کے دماغ سے چاند اور آنکھ سے سورج بنا- اس کے منہ سے اندر اور اگنی پیدا ہوئے اور سانس سے ہوا پیدا ہوئی- رگ وید کے دسویں منڈل میں اس باب پر عجز کا اظہار کیا گیا ہے کہ تخلیق کائنات کا مسئلہ انسانی شعور سے بالا تر ہے- اس میں کہا گیا ہے کہ وہ جو آکاش پر ہے اور ساری کائنات کی نگہبانی کر رہا ہے' صرف وہی جانتا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی- یہ کہاں سے ابھری- کیا اس نے اس کی بنیاد رکھی یا یہ خود بخود وجود میں آگئی- کون ہے جو یقین سے بتا سکے کہ تخلیق کائنات کیونکر ہوئی- ابتداء میں نہ عدم تھا نہ وجود- نہ ہوا تھی نہ آسمان اور نہ پانی تھا اور نہ ہی اسکی اتھاہ گہرائیاں- اس وقت نہ حیات تھی نہ موت- نہ دن کی روشنی تھی نہ رات کی تاریکی- نہ چاند تھا' نہ سورج- بس وہی اکیلا موجود تھا اور اس کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی- کائنات پانی ہی پانی تھی- وہ گرمی کی طاق سے نمودار ہوا اور اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی جو ذہن کی ابتداء تھی-

ایرانی قوم بھی آریہ نسل سے تعلق رکھتی ہے- ایرانی قبل از اسلام زرتشی مذہب کے پیرو تھے- ان کی کتاب اوستا سے ان کا عقیدہ تخلیق معلوم ہوتا ہے- اوستا پارسی مذہب کی ایک متبرک کتاب ہے' جس کی نسبت جناب زرتشت سے کی جاتی ہے- اوستا کے مطابق کائنات کو آہور مزدا نے تخلیق کیا اور اسی نے سورج اور ستارے پیدا کر کے ان کے راستے مقرر کئے- چاند اسی کے حکم سے بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے- اسی کے حکم سے زمین اپنی جگہ پر قائم ہے- وہی بادلوں کو آسمان پر روکے رکھتا ہے- اسی نے پانی نباتات' روشنی اور تاریکی اور شب و روز بنائے- اسی نے دوپہر اور شام بھی پیدا کی- وہی ہے جو خواب اور بیداری پیدا کرتا ہے- اسی نے انسان کو پیدا کر کے اسے اپنے فرائض یاد دلائے- ساسانی دور کی کتابوں میں انہی باتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے- کتاب بندہش میں لکھا ہے کہ دانائے کل اور خیر کل عرش پر تھا اور ضرر رساں اور نادان اہرمن ظلمت کی گہرائیوں میں تھا اور دونوں کے درمیان خلا واقع تھا- ہرمز کو اہرمن کے وجود کا علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اہرمن اس پر حملہ آور ہو گا- لیکن اہرمن ہرمز کے کے وجود سے بے خبر تھا- وہ ظلمت کی گہرائیوں سے نکل کر ایسی جگہ پہنچا جہاں نور ہی نور تھا- وہ ہرمز کے اس نور کو ہلاک کرنے کے لئے آگے بڑھا لیکن شکست کھا کر واپس ظلمت میں چلا گیا' جہاں

اس نے بھوتوں کی تخلیق کی۔ لیکن ہرمز نے اہرمن سے نو ہزار برس کے لئے صلح کر لی تاکہ وہ تخلیق کا کام اطمینان سے مکمل کرے۔ اس نے آسمان کو انڈے کی طرح چمکیلی دھات سے بنا کر اسے سورج اور چاند ستاروں سے منور کیا۔ پھر اس نے پانی بنا کر اس سے زمین بنائی جو گول ہے اور آسمان کے بیچوں بیچ قائم ہے۔ اس کے بعد اس نے پہاڑوں اور پہاڑوں میں دھاتوں کو بنایا اور زمین کے نیچے پانی کو رواں کر کے نباتات اور بیل کی تخلیق کی' اور سب سے آخر میں کیو مرث یعنی انسان اول کو بنایا۔ اس نے آسمان کی روشنی سے بیلوں اور انسانوں کا تخم بنایا' اور اسے بیل اور کیو مرث کے اندر داخل کر دیا تاکہ ان کی نسل کی افزائش ہو۔ پارسیوں کی تخلیق کی کہانی میں تخلیق کا ایک اور طریقہ بھی بتایا گیا ہے' جو رگ وید کی کہانی سے بہت ملتا جلتا ہے' وہ یہ کہ ہرمز نے ایک انسان کے جسم کے ٹکڑے کر کے اس کے سر سے آسمان' پاؤں سے زمین' آنسوؤں سے پانی' بالوں سے نباتات' اس کے دائیں ہاتھ سے بیل اور اس کے دماغ سے آگ کی تخلیق کی۔

عراق اور مصر کا درمیانی علاقہ جس میں آج کل شام' لبنان' اردن اور فلسطین واقع ہیں' قدیم زمانے میں کنعان کہلاتا تھا۔ یہ تین سو میل لمبا اور تین سو میل چوڑا بڑا ہی زرخیز علاقہ ہے۔ اس علاقہ پر یہودیوں کے قبضہ سے پہلے جو لوگ آباد تھے' ان کا سب سے بڑا دیوتا .بعل تھا' جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ .بعل افزائش فصل کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ .بعل کے لفظی معنی آقا اور مالک کے ہیں۔ لہٰذا اہل کنعان کا عقیدہ تھا کہ .بعل ہی نے کائنات کی تخلیق کی ہے۔ .بعل سے پہلے کنعانیوں کا سب سے بڑا دیوتا ایل تھا۔ ایک کنعانی داستان میں ہے کہ سمندر کے کنارے آگ سے دو لڑکیاں برآمد ہوئیں' جن سے ایل نے مباشرت کی۔ ان لڑکیوں کے بطن سے سات دیوتا پیدا ہوئے' جن کا ایک ہونٹ زمین پر اور دوسرا آسمان پر تھا۔ ان کے منہ سے پرندے اڑے اور مچھلیاں نکل کر سمندر میں چلی گئیں۔ گویا اس طریقہ سے کائنات کی ابتداء ہوئی۔ کنعانی اساطیر میں ہے کہ ایل کی بیوی عاشطرہ کے بطن سے ایل کی تین اولادیں .بعل' موت اور اناث پیدا ہوئیں۔ .بعل نے اناث سے شادی کر لی۔ اس لئے ایل اور موت .بعل سے نفرت کرنے لگے' چنانچہ .بعل کو اپنی عظمت ثابت کرنے کے لئے بہت سی مہمیں سر کرنا پڑیں۔ سمندر کے دیو "یم" کو ہلاک کرنے کے بعد .بعل نے اپنے دشمنوں کو چن چن کر ختم کیا۔ لیکن موت کے سامنے بے بس ہو کر وہ مر گیا۔ اس کی بیوی اناث نے شمس دیوی کی مدد سے اپنے خاوند کی لاش بڑی شان و شوکت سے دفن کر دی اور پھر تلوار سے موت دیوتا کا سر کاٹ کر اسے آگ میں جلایا اور اس کی راکھ کو کھیت میں بکھیر دیا۔ اس کے بعد .بعل دوبارہ زندہ ہو کر کنعان واپس آگیا۔ اس پر ایل نے کہا کہ اب چونکہ .بعل واپس آگیا ہے' اس لئے مجھے آرام کرنے دو۔ اہل کنعان کی نظر میں .بعل تخلیق و افزائش کا دیوتا تھا اور یم اور موت تخریب کے پیکر تھے۔ .بعل' یم اور موت کی جنگ دراصل تعمیری اور تخریبی قوتوں کی جنگ ہے' جس کا سراغ ہر دور کی کہانیوں میں ملتا ہے۔ ہر سال خزاں زندگی کے لئے موت کا پیغام لے کر آتی ہے اور ہر سال موسم بہار میں .بعل دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ تعمیر و تخریب کا یہ تصادم ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

یونانیوں کے عقیدۂ تخلیق کا ماخذ ہیسیڈ کی شاعری ہے' جو ہومر کے بعد یونان کا دوسرا بڑا شاعر ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں یونان کے دیوتاؤں کے نسب نامے لکھنے کے ساتھ ساتھ یونانی مذہب کی وضاحت بھی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ابتداء میں ہر طرف فساد (CHOAS) تھا۔ سب سے پہلے زمین پیدا ہوئی جو انسان کا مسکن بنی۔ اسکے بعد ٹار ٹارس دیوتا پیدا ہوا اور پھر اس کے بعد دیوتاؤں میں سے سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت محبت کا دیوتا ایروس (EROS) پیدا ہوا۔ فساد سے رات اور تاریکی پیدا ہوئی' جس سے ایتھر اور دن پیدا ہوا۔ پھر زمین و آسمان پیدا ہوئے اور دونوں کے باہمی

اختلاط سے سمندر وجود میں آئے اور انہی کے اختلاط سے ٹائٹن (TITAN) نسل پیدا ہوئی' جن کے پچاس پچاس سر اور سو سو ہاتھ تھے۔ آسمان ان سے نفرت کرتا تھا اور یہ بات زمین کے لئے ناقابل برداشت تھی' اس لئے اس نے اپنے بچوں سے کہا کہ وہ اپنے باپ یعنی آسمان کو قتل کر دیں۔ یہ کام کونس نامی ایک ٹائٹن نے اپنے ذمے لیا اور زمین نے اس کو ایک درانتی دے کر اسے گھات میں بٹھا دیا۔ جب آسمان رات کو لئے ہوئے زمین کی طرف آیا تو کرونس نے اسے قتل کر کے سمندر میں پھینک دیا۔ آسمان کے خون کے قطروں سے فیوریاں (FURIES) پیدا ہوئیں اور اس کے گوشت سے لپٹنے والی سمندر جھاگ سے ایفرو ڈائٹ دیوی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ٹائٹن نسل کے لوگوں نے کوہ اولمپس کو فتح کر کے کرونس کو اس پر تخت نشین کر دیا۔ کرونس نے اپنی بہن "رھی" سے شادی کر لی تو زمین اور آسمان نے پیش گوئی کی کہ ایک دن کرونس کی اولاد بھی اسے اسی طرح معزول کر دے گی جس طرح اس نے انہیں حکومت سے بے دخل کیا ہے' چنانچہ کرونس اپنے تمام بچوں کو نگل گیا لیکن "رھی" نے خفیہ طور پر زیوس (ZEUS) کو کریٹ میں جنم دیا اور جب وہ جوان ہوا تو اس نے کرونس کو تخت سے محروم کر کے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے بچوں کو اگل دے۔ اس کے بعد اس نے پوری ٹائٹن نسل کو زمین کی گہرائیوں میں پھینک دیا اور خود آقائے کل بن بیٹھا ہیسیڈ کے مطابق یہی داستان تخلیق ہے' لیکن یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ کیا یہ خیالات اس وقت یونانی تہذیب میں عام تھے یا یہ صرف ہیسیڈ ہی کی پرواز تخیل کا نتیجہ ہیں۔

سویڈن اور ناروے کی ایک نظم کے مطابق دیوتاؤں کی مجلس میں بیٹھے ہوئے "والوا" دیوتا نے تخلیق کے متعلق بتایا کہ ابتداء میں کچھ نہیں تھا۔ نہ زمین تھی' نہ آسمان اور نہ ہی سمندر۔ صرف انگڑائیاں لیتی ہوئی فضا کی پہنائیاں تھیں اور دیوتا "یامر" تھا۔ اس کے بعد دیوتا "بور" کے لڑکوں نے "میگارڈ" کو ابتری اور فساد سے نکالا۔ اس وقت جنوب سے سورج نمودار ہوا' لیکن سورج کو ابھی اپنے مستقر کا علم نہ تھا اور نہ ہی چاند اپنی قلمرو سے باخبر تھا اور ستارے بھی اپنے مقام کو نہیں جانتے تھے۔ اس وقت دیوتاؤں نے صبح' دوپہر اور شام کی تخلیق کی اور موسموں کو بنا کر ان کے نام رکھے۔ اس کے بعد انہوں نے اڈا کے میدان میں مل جل کر اپنے محلات تعمیر کئے اور خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے پاس مال و دولت کی کوئی کمی نہ تھی' لیکن بدقسمتی سے تھرس میڈن نامی ایک دیونی نے جو نہایت بدصورت تھی' آتے ہی ان کے عیش و آرام کے دن ختم کر دیئے اور جنگ و جدل کا زمانہ شروع ہو گیا دیوتا "اوڈن" "ولی" اور "دی" نے یامر کو قتل کر کے اس کے کون سے سمندر بنایا۔ اس کے گوشت سے زمین اور اس کی ہڈیوں سے چٹانیں اور پہاڑ اور اس کی کھوپڑی سے آسمان کا سرنگوں پیالہ بنایا۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے بہت سے بونے بنائے' جو زمین کے نیچے رہتے ہیں۔ ان بونوں نے انسا کے بہت سے پتلے بنائے لیکن دیوتاؤں نے ان پتلوں میں سے صرف دو کا انتخاب کیا اور ان میں سے مرد اور عورت کی تخلیق کی جن سے نسل انسانی آگے چلی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے عقیدۂ تخلیق کے متعلق عہد نامہ عتیق میں دو روائتیں ملتی ہیں۔ ایک یہودیوں کی بابل کی اسیری سے پہلے کی اور دوسری بابل سے رہائی کے بعد کی۔ ایک روائت میں ہے کہ کائنات ابتداء میں ایک بے آب و گیا ویرانہ تھی' اس کے بعد یہووا نے زمین و آسمان کو بنایا۔ دوسری روایت میں ہے کہ شروع میں پانی ہی پانی تھا۔ یہووا نے سب سے پہلے روشنی بنائی' پھر اس کے بعد آسمان زمین' سورج' چاند ستارے چرند پرند اور دریائی جانور بنا کر ان کے جوڑے بنائے اور سب سے بعد میں انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی پھونک دی' پھر اس نے مشرق کی طرف باغ عدن بنایا جس میں ہر قسم کے درخت تھے اور ان میں ایک شجر حیات بھی تھا اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک دریا تھا جو باغ سے نکل کر چار

حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا' جن کے نام جیحوں' دجلہ' فرات اور فیسون تھے۔ آخر میں اس نے حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا اور آدم و حوا سے نسل انسانی کی ابتداء ہوئی۔ عیسائیوں نے یہودیوں کے اسی عقیدہ تخلیق کو اپنا لیا' البتہ اس میں اقنوم ثلاثہ کا اضافہ کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ پیدا ہونے پھر مصلوب ہو کر دوبارہ جی اٹھنے اور آسمان پر چلے جانے کا اضافہ کر لیا۔

بعثت نبویؐ کے زمانہ میں اگرچہ انسانی شعور کی سطح کافی بلند ہو چکی لیکن علم کے لحاظ سے ابھی انسان کنویں کے مینڈک ہی کی طرح تھا۔ خود مکہ جیسے مرکزی شہر میں کل سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اسلام ایک روحانی' اخلاقی' معاشی اور معاشرتی تحریک کے ساتھ ساتھ ایک علمی تحریک بھی بن کر اٹھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام دعائیں امت ہی کیلئے تھیں اور اگر انہوں نے اپنے لئے کوئی دعا مانگی تو صرف یہ کہ اے اللہ ! میرے علم میں اضافہ کر۔ اس کے علاوہ علم کا حصول ہر مومن مرد اور عورت کا فریضہ قرار دیا گیا۔ اس وقت تک انسانی ذہن میں ایسی پختگی آگئی تھی' کہ وہ کائنات اور اشیائے کائنات کا مشاہدہ کر کے غور و فکر سے ان کا علم حاصل کرے۔ مسلمانوں میں ایسی علمی تحریکیں بھی شروع ہوئیں جو تاریخ عالم نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ یعنی سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے مشاہدے اور تجربے کو علم کی بنیاد قرار دیا۔ لیکن جہاں تک علم الافلاک کے حوالے سے تخلیق کائنات پر غور کرنے کا سوال ہے بہت سی مشکلات کی وجہ سے اس علم میں زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی۔ مسلمانوں کے زمانہ عروج میں بھی سب سے بڑی مشکل تو یہ تھی کہ انسان کو ابھی وہ وسائل مہیا نہیں ہوئے تھے' جن کی مدد سے آسمانوں پر ستاروں کی حرکت کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا جا سکتا اور نہ ہی ان مختلف علوم نے ابھی اتنی ترقی کی تھی جو علم الافلاک کے مطالعہ میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ ان مشکلات کے باوجود مسلمانوں نے افلاک کا جو بھی علم حاصل کیا وہ نہایت معروضی تھا جس سے بعد میں آنے والے ماہرین علم الافلاک کو بڑی مدد ملی۔

قرآن مجید میں واضح اشاروں کے باوجود مسلمانوں نے نہ معلوم کیوں ابتدائے آفرینش کے مسئلہ پر غور و فکر کرنا ضروری نہ سمجھا اور وہ خود بھی یہودیوں اور عیسائیوں میں رائج عقیدۂ تخلیق سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہودی اور عیسائی علماء جو مسلمان ہوئے انہوں نے بھی قرآنی آیات کے وہی معنی سمجھے جو ان کے سابقہ مذاہب میں مروج تھے اور جب قرآن مجید کی تفاسیر لکھی گئیں تو وہ تمام داستانیں ان میں داخل کر دی گئیں جو ابتدائے آفرینش کے متعلق یہودی اور عیسائی معاشرے میں رائج تھیں۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا ایسی تمام بے سروپا داستانیں مسلمانوں کا بھی عقیدہ بن گئیں اور اب یہی ہمارا سرمایہ علم تصور کیا جاتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ آج علم و دانش کی فراوانی اور اس کی وساطت سے پیدا ہونے والی روشن خیالی کے دور میں بھی مسلمان اپنے ایسے باطل عقائد پر قائم رہنے پر مصر ہے جس کی قرآن سے کہیں بھی تائید نہیں ہوئی۔ آج بھی مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ادھر خدا تعالیٰ نے لفظ **کن** کہا ادھر فوراً یہ کائنات اسی طرح وجود پذیر ہو گئی جیسی کہ وہ آج موجود ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کائنات کو چھ دن میں بنایا۔ عام مسلمان آج بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سب سے پہلے خدا تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کا مٹی کا پتلا بنایا پھر اس میں جان ڈال کر حوا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ ایک مدت تک دونوں کو جنت میں رکھا اور پھر شجر ممنوعہ کا پھل یعنی گندم کھانے کی پاداش میں دونوں کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیا۔ یہاں ایک بات قابل غور یہ ہے کہ یہودیوں کی داستان تخلیق میں نیک و بد کے علم کا درخت بڑا پر معنی ہے کیونکہ جس انسان میں نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحت پیدا ہو جائے اس کے لئے زندگی گذارنا کافی کٹھن ہو جاتا ہے

ور وہ ہر وقت اپنے آپ سے برسرپیکار رہتا ہے۔ شائد اسی لئے انگریزی کی کہاوت گھڑی گئی ہے کہ IS BLESS IGNORANCE یعنی لاعلمی ایک طرح کی رحمت ہے۔ لیکن مسلمانوں نے گندم کا لفظ استعمال کر کے اپنی تفاسیر میں ایک بڑی گھناؤنی علامت داخل کر دی ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مفسرین جو اپنے آپ کو بڑا روشن خیال اور ماڈرن تصور کرتے ہیں وہ بھی اس قسم کے غیر علمی تصورات کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں راسخ کرتے جا رہے ہیں۔

دوسری اقوام یا مذاہب میں یہ عقیدہ رائج ہے کہ پہلے کچھ نہ کچھ موجود تھا' خدا تعالیٰ یا دیوتاؤں نے اس میں نظم و نسق پیدا کر کے تخلیق کائنات کی۔ اس کے برعکس اسلامی تصور آفرینش یہ ہے کہ پہلے کچھ بھی موجود نہیں تھا' خدا تعالیٰ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا اور انہوں نے ساتویں دن خدا تعالیٰ کے آرام کرنے کے عقیدے کو بھی مسترد کر دیا ہے۔ عہد نامہ عتیق میں دوسری تفاصیل کے ساتھ تخلیق کائنات کا وقت مقرر کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ کائنات پونے چھ ہزار سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ مسلمانوں نے موضوع احادیث اور روایات کی رو سے کائنات کی ساخت اور وسعت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کے عرش کا مقام بھی متعین کر دیا۔ چنانچہ روایات و تفاسیر کے مطابق آسمان شیشے کا ایک ڈل ہے جو زمین سے پانچ سو سال کی مسافت پر قائم ہے۔ اسی طرح پانچ پانچ سو سال کی مسافت پر اوپر تلے چھ آسمان اور قائم ہیں جن کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔ اس سمندر میں چھ یا آٹھ پہاڑی بکرے کھڑے ہیں جو اتنے بڑے ہیں کہ سمندر کا پانی ان کے گھٹنوں تک پہنچتا ہے۔ ان بکروں نے اپنے سینگوں پر عرش عظیم کو اٹھا رکھا ہے جس پر خدا تعالیٰ متمکن ہے۔

بابلی ہوں یا مصری' ہندو ہوں یا چینی' یہودی ہوں' عیسائی یا مسلمان سب کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کو کسی غیر مرئی قوت نے تخلیق کیا ہے' لیکن تخلیق کائنات کی جو بھی تفاصیل بیان کی جاتی ہیں ان کی اب بتدریج عام میں کوئی وقعت نہیں۔ کوئی ذی شعور انسان ایسے تصورات کو جنس کا سد کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ علمی اور سائنسی تحقیق کے بعد ارتقائی نظریہ تخلیق نے مذکورہ قسم کے تمام عقائد کو انسانیت کے ایام طفولیت کا ذوق داستان سرائی سمجھ کر ان پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے۔ عقل و خرد کی کوتاہ دستی اور علم و دانش کی نارسائی کے باوجود انسان ہرز مانے میں جبلی طور پر مجبور رہا ہے کہ وہ اپنی سمجھ کے مطابق کائنات اور خالق کائنات کے متعلق کوئی تصور قائم کرے۔ لیکن تکوین کائنات کے متعلق جو بھی مواد تاریخ' آثار اور روایات کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے' جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں کیا گیا ہے' اس کی حیثیت معروضی نہیں بلکہ موضوعی ہے۔ محترم سید سبط حسن مرحوم کے خیال کے مطابق تکوین کائنات کے متعلق تمام داستانیں اس لئے وضع کی گئی تھیں کہ ان سے نسل انسانی کے ابتدائی ایام میں شکار کی دستیابی یا افزائش نسل کے لئے شگون لینا مقصود تھا اور یہ داستانیں مقررہ اوقات پر ڈراموں کی شکل میں کھیلی جاتی تھیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جناب سید سبط حسن صاحب مرحوم کا نقطہ نظر بتمامہ مبنی برحقیقت ہو۔ یہ مانا کہ تاریخ کے اولین ادوار میں نوع انسان تکوین کائنات کے متعلق متجسس نہ تھا اور نہ ہی علم انسانی کی ایسی وسعت ہی تھی کہ جس پر تحقیق و جستجو کی عمارت استوار ہو سکے۔ لیکن اس تمام کوتاہ دامنی کے باوجود ایک حساس اور خود شعور انسان انتہائے حیرت میں پکار اٹھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

سبزۂ گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہمارا خیال ہے کہ اسی استفہام کے جواب میں تخلیق کائنات کے متعلق یہ تمام داستانیں گھڑی گئی ہوں گی تاکہ ذوق جستجو کی کچھ تو تسکین ہو سکے۔ زمانہ قدیم میں چونکہ داستاں سرائی ہی ذریعہ اظہار تھی' اس لئے تکوین کائنات کے بیان کے لئے بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہو گا۔ اگرچہ ان داستانوں میں علمی تحقیق کا کوئی عنصر موجود نہیں لیکن اس سے انسان کے ذوق جستجو اور افسانہ طراز طبیعت کی کچھ نہ کچھ تشفی تو ہو جاتی ہو گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

[illegible] قریشی- کراچی

وصیت کی فرضیت

[illegible] فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو
[illegible] کا وقت آ جائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا ہو تو
[illegible] باپ اور رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت
[illegible] خدا سے) ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے- قرآن
[illegible] سورۃ البقرہ آیت 180)
[illegible] وارث کے لئے وصیت کرنا
[illegible] لا وصیۃ لوارث
[illegible] نہیں- حدیث بخاری)
[illegible] وصیت کی اہمیت سے کسی کو انکار نہ ہو گا- ہر قوم کی
[illegible] کی بنیاد ان کے معاشی نظام پر ہی منحصر ہے-
[illegible] ایک بڑا سنگین مسئلہ ہے- بعض اوقات نماز پر
[illegible] فوقیت رکھتا ہے- اتنے بڑے مسئلہ پر خدائے بزرگ و
[illegible] قرآن محکم میں کچھ ہدایات دی ہوں گی چنانچہ قرآن
[illegible] میں بار بار انفاق کا بیان آتا ہے- انفاق کا لفظ بنا ہے
[illegible] نفق اس سرنگ کو کہتے ہیں جس میں داخل
[illegible] اور باہر نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں لہٰذا اس
[illegible] سے نفق- نیفہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے دونوں
[illegible] کھلے ہوتے ہیں- اس لئے انفاق کے معنی ہیں اپنی
[illegible] کو اس طرح کھلا رکھنا کہ جس وقت ضرورت پڑے وہ
[illegible] ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے کام
[illegible] سے عام طور پر خرچ کرنا کہتے ہیں- انفاق کی بہترین
[illegible] سورۃ البقرہ کی آیت 219 میں ملتی ہے- ارشاد ہوتا ہے-
[illegible] اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ
[illegible] کون سا مال خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ
[illegible] اس طرح خدا تمہارے لئے اپنے احکام کھول کھول کر
[illegible] بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو-" (قرآن 2:219)
چونکہ اس آیت میں کوئی جبر نہیں ہے پوری طرح

اختیاری (رضا کارانہ) ہے لہٰذا اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا- پوری اسلامی تاریخ میں صرف ایک واحد ہستی (پیغمبروں کے بعد) ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے جنہوں نے ایک موقعہ پر اپنا سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر لا کر رکھ دیا- اصل راز جو اس میں پوشیدہ ہے وہ یہ کہ ایک فرد واحد کے کرنے سے اس کے حقیقی ثمرات حاصل نہیں ہوں گے جب تک کہ معاشرہ کا ہر فرد ایسا نہ کرے- تو پھر کیا بات ہے کہ- کل کی کسی کو فکر نہ ہو گی کہ کل کیا کھائیں گے اور کیا پہنیں گے- بیمار پڑیں تو کون علاج کرے گا- سب چیز کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر ہو گی-

لیکن آج کل جس طرح کا معاشرہ ہے جس میں ٹیکس تک کوئی خوشی سے دینا نہیں چاہتا- زکوٰۃ کی کٹوتی سے بچنے کے لئے اپنا مسلک تک بدل دیتے ہیں- ایسے معاشرہ میں یہ امید رکھنا کہ اپنی ضروریات سے زیادہ جو کچھ ہے معاشرہ کو دے دے ناممکن نظر آتا ہے- یہ بات اللہ تعالیٰ کو کھربوں سال پہلے سے معلوم تھی لہٰذا بعض اوقات خرچ کرنے پر رضا کارانہ اختیار دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے بعض مواقع پر خرچ کرنا فرض قرار دے دیا- مثال کے طور پر:

1- روزہ نہیں رکھ سکتے تو فدیہ دے دو- (قرآن محکم 2:184)

ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا-

2- بالارادہ قسم توڑنے کا کفارہ غلام آزاد کرنا' دس محتاجوں کو کھانا کھلانا یا کپڑے دینا یا تین دن روزے رکھنے (قرآن محکم 5:89)

3- زکوٰۃ دینا- (قرآن محکم بار بار)

4- وصیت کی فرضیت (قرآن محکم 2:180)

آخری عنوان ہی ہمارا موضوع بحث ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن محکم میں فرماتے ہیں۔

"تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا ہو تو ماں، باپ اور رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے (خدا سے) ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے۔" (سورۃ البقرہ آیت 180)

یہ حکم ایسا تاکیدی ہے کہ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ اس کی تاکید کی گئی ہے اس کے باوجود ہمارے مسلم معاشرہ میں وصیت کا رواج ختم ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ اس آیت میں کوئی ابہام نہیں بالکل صاف صاف اور کھلی ہوئی آیت ہے۔

بات دراصل یہ ہوئی کہ سورۃ النساء کی آیت گیارہ اور بارہ میں ورثاء کے حصے مقرر کر دیئے گئے۔ اس لئے لوگوں نے اس وصیت کی آیت کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد حدیثوں کی وہ بھرمار ہوئی، جس میں بخاری اور دیگر کتب کی یہ حدیث **لا وصیتہ لوارث** اتنی مشہور اور مقبول ہوئی کہ لوگوں نے وصیت والی آیت (قرآن 2:180) کو بالکل بھلا دیا اس کے بعد "عقیدہ نسخ فی القرآن" وضع کیا گیا اور اس کے تحت یہ آیت منسوخ قرار دے دی گئی اور آج یہ حالت ہے کہ وصیت کرنا عجیب بات بن کر رہ گئی ہے۔

میں قرآن مجید یا قرآن شریف یا قرآن حکیم لکھنے کے بجائے قرآن محکم لکھتا ہوں۔ اس سے یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن محکم کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔ یہ ناسخین قرآن کی غلط فہمی اور ہٹ دھرمی ہے ورنہ مطلب صاف اور عیاں ہے۔

جو آیات عقیدہ نسخ فی القرآن کے تحت منسوخ قرار دے دی گئی ہوں یا من گھڑت روایات کے رواج پانے سے بھلا دی گئی ہوں میرا مقصد انہی آیات کی تشہیر اور تبلیغ کرنا ہے۔

پھر ہم لوٹ کر اصل موضوع بحث کی طرف آتے ہیں یعنی وصیت کی فرضیت۔ کیا ناسخین قرآن حق پر ہیں جو اس آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں اس کا جواب امام العصر سید اعظم سرسید احمد خان نے بہت اچھی طرح سمجھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں جس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔

"سورۃ النساء کی گیارہ اور بارہ آیت جس میں ورثاء کے حصے مقرر کر دیئے ہیں نازل ہونے کے بعد آیت وصیت (سورۃ البقرہ 18) منسوخ ہو جانا لازم نہیں آتا کیونکہ آیت وصیت کے نازل ہونے کے بعد یہ ضروری نہ تھا کہ کوئی شخص بلا وصیت مرے گا۔ پس جو لوگ باوجود حکم وصیت کے بلا وصیت مر جائیں ان کے مال کی تقسیم کے لئے کوئی قاعدہ قانون مقرر ہونا چاہئے۔

وہ قاعدہ سورۃ النساء کی آیات گیارہ اور بارہ میں قرار پایا۔ پس قرآن محکم کی دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرنے والے نے اگر وصیت کی ہے تو اس کا مال وصیت کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ اگر مرنے والا اچانک مر جائے وصیت کی مہلت نہ ملی ہو تو اس کا مال ان مقرر کردہ حصوں (سورۃ النساء آیت گیارہ اور بارہ) کے مطابق بٹے گا۔ پس دونوں آیتوں کا حکم بحال اور قائم رہا۔"

امام العصر سید اعظم سر سید احمد خان نے اتنی خوب صورتی سے مطلب واضح کیا ہے کہ اب کوئی ابہام یا غلط فہمی نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے باوجود اگر ناسخین قرآن بضد ہوں تو یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے۔

دور جدید کے ایک اور عالم کا موقف بھی سن لیں۔ عبید اللہ سندھی بھی "عقیدہ نسخ فی القرآن" پر ایمان نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سی منسوخ آیات کو اپنے دلائل سے محکم ثابت کیا۔ اس کے باوجود پانچ آیات ایسی رہ گئیں جن کو وہ محکم ثابت نہ کر سکے۔ جس کا ان کو بہت افسوس تھا ان پانچ آیات میں ایک آیت یہی وصیت کی بھی تھی لیکن جب وہ زیادہ عمر کو پہنچے اور انہیں خدشہ ہوا کہ ان کی اولاد اپنی غیر مسلم ماں کو کچھ نہیں دیں گے تو انہوں نے وصیہ

کرنا فرض سمجھا اور اس طرح یہ آیت بھی محکم ثابت ہوئی۔

یہ تو تھے دور جدید کے گنتی کے چند علماء میں سے دو علماء کا موقف اسی طرح سابقہ دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے علماء "عقیدہ نسخ فی القرآن" کے قائل نہ تھے لہٰذا انہوں نے وصیت والی آیت (سورۃ البقرہ 180) کو منسوخ نہیں کہا۔ ان میں قابل ذکر نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) علامہ خفاجی (2) امام راضی (3) حسن بصری (728ء) (4) طوس (734ء) (5) عطاء بن زید بن یاسر (6) زاہک (723ء) (7) معروف (783ء) (8) مومن بن راشد اور دوسری فاضل ہستیاں شامل ہیں۔

بدقسمتی سے موجودہ دور کے علماء کی اکثریت کا ایمان "عقیدہ نسخ فی القرآن" پر ہے۔ گنتی کے چند علماء کو چھوڑ کر۔ ہمارے ملک کے قانون میں بھی صرف ایک تہائی کی وصیت کی جا سکتی ہے (اختیاری) جس کی بنیاد بھی حدیثوں پر ہے۔ حالانکہ قرآن میں وصیت کے لئے نہ تو یہ کہا گیا ہے کہ اتنے حصے کے لئے وصیت کی جا سکتی ہے اس سے زیادہ کے لئے نہیں۔ نہ ہی یہ کہ فلاں کے لئے کی جا سکتی ہے فلاں کے لئے نہیں۔ ہر شخص اپنے پورے ترکہ کے متعلق جس (یا جن جن) کے حق میں چاہے وصیت کر سکتا ہے اور یہ فرض ہے ہر مسلمان پر۔ اب جب کہ ہر طرف سے اسلامی نظام کی آواز لگائی جا رہی ہے وصیت کے متعلق بھی قانون میں ترمیم ہونی چاہئے اور تمام شہریوں پر وصیت کو لازمی قرار دیا جانا چاہئے تاکہ مسلمان انفاق کی طرف راغب ہوں اور معاشرہ سے بھوک' افلاس' غربت اور جہالت کا خاتمہ ہو۔

TOLU-E-ISLAM CONVENTION

YOU ARE CORDIALLY INVITED TO THE ANNUAL
TOLU-E-ISLAM CONVENTION
BEING HELD AT LAHORE ON OCTOBER 20, 1995.
PLEASE CONTACTTHE NEAREST
BAZM-E-TOLU-E-ISLAM
OR WRITE TO NAZIM IDARA TOLU-E-ISLAM, LAHORE,
FOR FORMAL INVITATION CARD.
CHAIRMAN IDARA TOLU-E-ISLAM

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Parwez (r)

BOOKS AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO AVAILABLE AT THE FOLLOWING PLACES.

1.	CANADA 716 The West Mall,Suit 1804 Etobicoke, ONT (416) 620-4471	First Sun 11AM
2.	DENMARK Herninggade 8.st th., 2100 Copenhagen 0	Last Sat 2 PM
3.	Kuwait Flat No. 6, Floor No. 3 Taher Bu Hamad Building Oppsite Al-Othman Mosque, Hawally, Kuwait	Friday 5.PM
4.	NORWAY Akeberg Veien-56, Oslo-6 Galgeberg, 4th floor	1st Sun 4PM
5.	UNITED KINGDIM	
	(i) Birmingham 229 Alum Rock Road	Sunday 3PM
	(ii) London 76 Park Road Ilford Essex Phone 081-553-1896	1st Sun 2:30PM
	(iii) Yardley 633 Church Road, Yardley, Birmingham B33 8HA (Phone 021-628-3718)	Last Sun 2PM
	(iv) Essex 50 Arlington Road, Southend-on-Sea ESSEX SS2 4UW, Phone 0702-618819	2nd Sun 3PM
	(v) Yorkshire Cardigan Community Centre 145-49 Cardigan Road LEEDS-6 Contact M. Afzal Phone 0532-306140	1st Sun 3PM
ON AIR		
	Dars-e-Quran Oslo (NORWAY)	Thursday 21:00PM

پاکستان میں
علامہ غلام احمد پرویزؒ
کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

مقام	دن	وقت
595 کے۔ ایل کیمال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین	منگل	3 بجے سہ پہر
K/355 گنج روڈ فون: 5729 (برائے خواتین)	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
بر مکان محمد اسلم صاحب۔ مرضی پورہ گلی نمبر5۔ رابطہ فون: 2438	پہلا اور تیسرا جمعہ	9 بجے صبح
دفتر جناب عبداللہ ثانی صاحب ایڈووکیٹ۔ کابلی بازار۔ رابطہ: 270737	ہر بدھ و جمعہ	5 بجے شام
بر مکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	4 بجے شام
مکان نمبر 140/139- مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	9 بجے صبح
بر مطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	3 بجے سہ پہر
بر مکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد' جی۔ ٹی روڈ	جمعۃ المبارک	6 بجے شام
یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	10 بجے صبح
ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر عٹہ بازار	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
بر مکان چوہدری عبدالحمید	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
گولڈن سینٹری' عثمان آباد	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
B-12 قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر	جمعۃ المبارک	بعد نماز عصر
بلاک G- کچہری روڈ' رابطہ انیس الرحمان فون: 61519	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
بر مکان چوہدری ایس۔ ایم صادق' مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	10 بجے صبح
بمقام 4385/47-E اپر سٹوری ہائی وے آٹوز نزد پل لئی گوا لمنڈی راولپنڈی فون: 74752	جمعۃ المبارک	4-30 بجے شام
60- اے سول لائنز' ریلوے روڈ۔ رابطہ فون: 720083	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
محمد افضل نظمی' ایبٹ روڈ۔ رابطہ فون: 263252	پہلا اور دوسرا جمعہ	8 بجے صبح
23- سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون: 720096	ہر جمعۃ المبارک	5 بجے شام
چمن زاہد 19- بی بلاک 13- ڈی گلشن اقبال مقابل اردو سائنس کالج رابطہ خالد گل فون: 539798	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح

شہر	مقام	دن	وقت
21- کراچی	مکان 16 گلشن مارکیٹ' 36/C ایریا کورنگی 5 رابطہ: محمد سرور' فون: 312631	جمعۃ المبارک	11-30 بجے صبح
22- کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ ایاز حسین انصاری رابطہ فون: 4571919	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
23- کراچی	برمکان محمد یونس 1206- گلی 10- اے' G-36 شریف کالونی۔ لانڈھی رابطہ: فون: 312631	اتوار	8 بجے شب
24- کوہاٹ	برمکان شیر محمد' نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
25- کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ	جمعۃ المبارک	4 بجے سہ پہر
26- گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ' سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
27- گجرات	مرزا ہسپتال' کچہری روڈ	جمعرات	3 بجے
28- لاہور	25- بی گلبرگ II (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
29- لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	جمعۃ المبارک	بعد نماز مغرب
30- ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	جمعۃ المبارک	9 بجے صبح
31- مامون کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک 509 گ ب	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ
32- اوکاڑہ	برمکان میاں محمد سعید مکان 116 گلی 6 سیٹھ کالونی نمبر2 رابطہ فون: 3660	ہر جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
33- واہ کینٹ	برمکان محمد داؤد' کوارٹر نمبر 19E/119	بدھ	بعد نماز عصر

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی دستیاب ہے۔
تحریک طلوع اسلام سے متعلق استفسارات مندرجہ بالا مقامات پر موجود کارکنان تحریک کے حوالہ کیجئے۔
جواب ادارہ سے براہ راست دیا جائیگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریک پاکستان کی دینی اساس سے متعلق، ذاتی مشیر، منفرد مفکر قرآن
بانی تحریک طلوع اسلام اور تحریک پاکستان گولڈ میڈلسٹ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی تصنیفات

جولائی 1995ء

نام کتاب	قیمت ستوڈنٹ	قیمت اعلیٰ
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ)	Rs.	Rs. 390
(کھلے پارے- فی پارہ)	Rs.	Rs. 13
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	Rs.	Rs. 390
(تین جلدوں میں- فی جلد)	Rs.	Rs. 130
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلد)	Rs.	Rs. 600
چار جلدوں میں (فی جلد)	Rs.	Rs. 150
تبویب القرآن (تین جلدوں میں)	Rs.	Rs. 475
(ایک جلد میں)	Rs.	Rs. 475
مطالب الفرقان (مکمل سیٹ)	Rs.	Rs. 1100
جلد اول	Rs. 75	Rs. 150
جلد دوم	Rs.	Rs. 150
جلد سوم	Rs. 75	Rs. 150
جلد چہارم	Rs. 100	Rs. 200
جلد پنجم	Rs. 75	Rs. 150
جلد ششم، ہفتم (فی جلد)	Rs.	Rs. 150
من و یزداں	Rs. 100	Rs. 200
ابلیس و آدم	Rs. 90	Rs. 180
جوئے نور	Rs. 80	Rs. 160
برق طور	Rs. 80	Rs. 160
شعلہ مستور	Rs. 80	Rs. 160
معراج انسانیت	Rs. 125	Rs. 250
مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں	Rs. 40	Rs. 80
انسان نے کیا سوچا؟	Rs. 100	Rs. 200
اسلام کیا ہے؟	Rs. 70	Rs. 140

نام کتاب	قیمت	
	سٹوڈنٹ	اعلیٰ
کتاب التقدیر	Rs. 90	Rs. 180
جہان فردا	Rs. 80	Rs. 160
شاہکار رسالت	Rs. 100	Rs. 275
نظام ربوبیت	Rs. 90	Rs. 180
تصوف کی حقیقت	Rs. 90	Rs. 180
قرآنی قوانین	Rs. 35	Rs. 75
سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	Rs. 50	Rs. 120
(جلد دوم)	Rs. 40	Rs. 100
(جلد سوم)	Rs. 60	Rs. 140
طاہرہ کے نام خطوط	Rs. 40	Rs. 80
ختم نبوت اور تحریک احمدیت	Rs.	Rs. 80
حسن کردار کا نقش تابندہ	Rs.	Rs. 40
اقبال اور قرآن (جلد اول)	Rs.	Rs. 80
(جلد دوم)	Rs.	Rs. 120
Islam A Challenge to Religion	Rs. 80	Rs. 160
Exposition of The Holy Quran	Rs.	Rs. 350
Vol. 1 (Upto Sura Al-Kahaf)	Rs.	Rs.
Islamic Way of Living	Rs. 30	Rs. 40
اسلامی معاشرت	Rs. 25	Rs. 75
اسباب زوال امت	Rs. 20	Rs. 60

متفرق کتب

مقام حدیث	Rs. 40	Rs. 120
قرآنی فیصلے (جلد اول) (مشتمل برسابقہ جلد اول' دوم' سوم)	Rs. 120	Rs. 225
قرآنی فیصلے (جلد دوم) (مشتمل برسابقہ جلد چہارم و پنجم)	Rs. 120	Rs. 225
قتل مرتد' غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	Rs.	Rs. 30
ابلہ مسجد	Rs. 100	Rs.
تحریک پاکستان اور پرویزؒ	Rs. 100	Rs. 250
نوادرات	Rs. 100	Rs.
The Pakistan Idea	Rs. 100	Rs.

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 بی گلبرگ نمبر 2 لاہور 54660 (پاکستان) فون 879246 - فیکس 876219

نوٹ: طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

(ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں- یہ قیمتیں کسی وقت بھی تبدیل کی جا سکتی ہیں)

طلوع اسلام کنونشن

1995ء

طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن اپنے روائتی وقار و سنجیدگی اور سادگی و شادابی کے ساتھ لاہور میں
مئورخہ 19-20-21 اکتوبر بروز جمعرات' جمعہ و ہفتہ منعقد ہو گی
کنونشن کے دو اجلاس کھلے ہوں گے جن میں وہ تمام حضرات شرکت کر سکیں گے جو ان میں
پیش کردہ مقالات و خطابات و تقاریر کو سنجیدگی اور سکون سے سننا چاہیں۔

مجوزہ پروگرام

- پہلا اجلاس (برائے مندوبین) : 19 اکتوبر' بروز جمعرات' سپہر 3 بجے
- دوسرا کھلا اجلاس : 20 اکتوبر' بروز جمعہ' صبح 9 بجے
- تیسرا اجلاس (بزم مذاکرہ) : 20 اکتوبر' بروز جمعہ' سپہر 3 بجے
- چوتھا اجلاس (برائے اراکین ادارہ) : 21 اکتوبر' بروز ہفتہ' صبح 9 بجے
- واضح رہے کہ طلوع اسلام کے اجلاس کی حیثیت عام پبلک جلسوں کی سی نہیں ہوتی۔ یہ ایک طرح کی نہایت سنجیدہ و پروقار علمی محفلیں ہوتی ہیں جن میں نظم و ضبط اور آداب مجلس کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے۔
- بزمہائے مذاکرہ میں تقریری مقابلے انعامی ہوں گے۔ مذاکرہ میں شامل ہونیوالے طلبا و طالبات کو اپنے مقالے کنونشن سے کم از کم 25 دن قبل ادارہ کو ارسال کرنا ہوں گے۔ منتخب مقالہ نگاروں کو اپنا مقالہ خود پڑھنے کی دعوت دی جائے گی۔
- ادارہ کے کیمپ میں حسب سابق رہائش اور کھانے کا بندوبست ہو گا۔

موسم کے مطابق بستر البتہ خود لانا ہو گا۔ کیمپ میں داخلہ بذریعہ دعوت نامہ ہو گا۔

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام

(3) According to the Quran, the only Divine intervention is "*Wahi*" The Directive Power of Allah. It is revealed in words, in clear terms, and remains outside of the receiver, The "Nabi" Any other form of Divine intervention is an illusion, a hallucination. This leads us to a very serious implication. Any claim of Divine intervention today, is a severe violation of the finality of "*Nabuwwat.*" "*Wahi*" the only form of Divine intervention, ended 1400 years ago.

Like Dr. *Wadood*, any individual could narrate instances of being saved from an impending death. I can also recount several such eerie instances. But they have been of no consequence after a temporary excitement. The case of such instances can he stretched far too far indeed to our liking. One could ask why was there no Divine intervention when in the battle of *Uhad*, *Hazrat Muhammad* was wounded and also lost some of his teeth. He was also poisoned, and although he survived at the time, he eventually died of it. Had it not been for it, he could have lived longer for the benefit of humanity. This leads us to what I consider as the greatest tragedy of humanity, the assassination of *Hazrat Umar, Ameer-ul-Momineen*. His "*Farooqiat*", his high standard of administration, and his long term plan to educate the neo-converts to Islam, especially in Iran, the world today would have been very different and the suffering and pain of humans would not have been so prolonged and so intense in the past 1400 years. I ask: Why did not Divinity intervene and stay the hand of the assassin, Feroz? One could be angry and real mad at the Divine Power, may be even deny its existence had it not been for the Quranic introduction of Allah as having self-imposed the laws of cause and effect on Himself. Though designed by Himself, He will never violate them. Indeed, only such a Principled-Allah has the right to create and maintain the magnitude and grandeur of this Universe of which we still know very little.

In the end, I cannot help recalling from history the case of *Jalalluddin Akbar*, the Mughal Emperor. Though almost illiterate, he was a pragmatic intellectual. He was told of a man who forecast the year and time of the death of anyone who cared to ask him. Akbar invited him to his court and checked with him on the age of all those present, including himself. Then he asked the forecaster about his own moment of death, which he forecast several years in the future. Akbar summoned his executioner and ordered the beheading of the man, which he did. It was a despotic and barbaric way of disproving pragmatically the idea of the moment of death being fixed, but it clinches the matter.

IS THE MOMENT OF DEATH FIXED?

By

Miss Shamim Anwar

Dr. Abdul Wadood's article on "Is the moment of death fixed?" (موت کا ایک دن معین ہے؟) in the month of August, disturbed me a great deal, all the more so coming from a person of his stature in the realm of Quranic literature. However, it is a saving grace that in the end he has left the question open and has invited readers to throw some light on the issue.

I do feel awkward in making an attempt, for if *Parwez*, the Teacher, could not fully satisfy Dr. *Wadood*, I do not see how I can. Also, in the presence of *Parwez's* comprehensive and scholarly book "*Kitab-ul-Taqdeer*", a small fry like me does not have much more to say. But the issue is so sensitive that I cannot afford to keep mum,even if it means merely pinpointing the counter questions that arise in ones mind on whether the moment of death is fixed and predestined?

It is interesting to note that Dr. *Wadood* draws a line between universal laws of cause and effect that govern our physical existence, and on the other hand certain happenings and accidents from which an individual escapes death rather unexpectedly! Having said this, he goes on to narrate several episodes in his life whence he was saved within hair's breath. For instance within two minutes of his leaving one bunker for another during the Second World War, a bomb exploded in the one he had left and he was saved. Similarly, he happened to alight from a raft on a high level bank of a swollen river only to witness the drowning of all the other rafts; and so on and so forth, Dr. *Wadood* wonders whether his precarious survival in the varied happenings was not the direct Divine intervention on his behalf! In this context, at least three questions arise in my mind!

(1) The Quran, to prove its veracity and Divine origin, throws a challenge to the humans that it entertains absolutely no contradictions. Indeed! Divinity alone could make such a claim. And yet Dr. *Wadood's* approach belies it. The law of cause and effect as designed by the Divine power, functioning unchangeably and inexorably, has according to him a contradictory aspect wherein Divine intervention is taking place sometime, somewhere, all the time. This is a serious matter in the understanding of the Quran.

(2) Divine intervention on behalf of one or more individuals smacks of favouritism and human frailty. Allah is equidistant towards each human irrespective of any consideration. Besides, it describes each individual as unique and special, why should then some be allowed to die? On the contrary, the Quran decries the killing of one individual as the killing of humanity, and saving of one individual is the saving of humanity. Thus the position that Dr. *Wadood* has taken does not fit into this Divine pattern designed for us.

Imam of the Shah Chiragh Mosque, Lahore, started some sort of study classes in the mosque, my advice to him was to have a good library of books on Fiqah, and I made my humble contribution towards it. But nothing worth of note came out of it. Let us hope the exhortations by the head of the Judiciary in the State has the desired effect (Reference PLD (Journal Sec) 1965.

THEY SHALL NEVER DIE

Who can defeat a nation which knows to play hide and seek with death ? I may not remember the Indo-Pakistan war but I will never forget the smile full of nerve the conducting army officer gave me. This smile told me how fearless and brave are the Pakistani young men. Playing with fire to these men from the Jawan to the General Officer Commanding, was like children playing with marbles in the streets....

".....I asked the G.O.C, how is it that despite small number you are overpowering the Indians ? He looked at me, smiled and said: 'If courage, bravery and patriotism were purchasable commodities, then India could have got them along with American Aid,....."

LOUIS KARRAR, "The Time Magazine"
September 22, 1965

...t the grave happy, prosperous and useful by following not the law of the jungle but rational rules of conduct. Those who came to occupy ministerial saddles were not ignorant of this demand of the public and a few years after the establishment of Pakistan, the Government set up a Law Commission under the Chairmanship of Mr. Justice A.S.M. Akram, the other members being Maulana Syed Suleman Nadvi, Maulana Mufti Muhammad Shafi, Maulana Muhammad Jaafar, Dr. Khalifa Shujauddin, Mr. Justice Muhammad Bukhsh Memon and myself as member-*cum*-Secretary. During the short time that the Commission functioned, I had occasions to study the legal systems of some of the Muslim countries, but my study which was confined to some reference books, did not go very far. Ultimately, a small three member interim report (by the Chairman, Mr. Justice Muhammad Bukhsh Memon and myself) which in reality was just an apology for a report, was submitted to the Government, and even though it was given out that the report would be published for eliciting public opinion, it did not see the light of the day. Perhaps, the Government of the time was not serious about the Law Commission and had set it up just to appease the public, and unceremoniously dissolved it after sometime.

Practical Steps

7. How sad it is that leaving alone the laymen, even those who should know better (lawyers and Ulema) while talking of the enforcement of the Quranic law refer only to two items, namely, cutting off the hands of the thief and stoning to death of the adulterer. These delightful people think that the Quran has nothing to say about other matters and that the enforcement of these two injections is all that is desired or necessary. they forget that the Quran makes provision for and speaks practically of all problems which confront man on this earth whether falling under the category of civil and criminal laws, social and economic life, or international matters, and aims at establishing a rational society with strong and sound economic, social and legal foundation. It gives as much and even more importance to the maintenance of social and economic ties than to the punishment for theft, adultery etc. Let us hope the lead given by our Chief Justice stirs up the intellectuals of the society and some practical steps are taken to implement the constitutional provision, referred to above, which is the very basis of the creation of Pakistan. It is necessary to stimulate public thought so that our intellectuals, who have mostly grown up through spoon feeding, may feel the need of doing spade work themselves. In this connection the establishment of study circles with adequate library facilities, suggested by the Chief Justice should be among the very first steps. The Islamic Research Institute set up under Article 207 of the Constitution has not taken the Public into confidence about its achievements. It would not be out of place to mention that some years ago when Allama Ala-ud-Din Siddiqi (now Chairman of the Advisory Council of Islamic Ideology) in his capacity as the

Napoleon Bonaparte on Islam

3. In the year 1798, Napoleon Bonaparte addressed a letter to Sheik El-Messiri of Cairo wherein he stated:-

"I hope that the time is not far off when I shall be able to assemble all the wise and learned men of this country and establish a uniform government, based on the principles of the Koran, which alone are true and capable of bringing happiness to man."(The Mind of Napoleon by J. Christopher Harold, Columbia University Press, page 104).

Fates however, did not accommodate him to implement this resolution of his.

Bernard Shaw On Islam

4. Some years ago I was in England and there I came across a press note recording an interview with Mr. Bernard Shaw. He was reported to have said that Islam was to be the future religion of the world. When asked why in the face of this belief, he did not accept Islam, Mr. Shaw retorted that while he wished to adopt Islam as his religion, he did not like to be a member of the society, which, at the moment, professed it.

Chief Justice Cornelius On Enforcement of Quranic Laws in Pakistan

5. We in Pakistan have now a clarion call from another Christian intellectual friend. Ever since Mr. Justice Cornelius assumed charge of his exalted office, he, in spite of his obvious handicaps, has been at pains to impress on the public and the authorities the need of finding ways and means for implementing the policy provision of the Constitution which says:

> "The Muslims of Pakistan should be enabled, individually and collectively, to order their lives in accordance with the fundamental principles and basic concepts of Islam, and should be provided with facilities whereby they may be enabled to understand the meaning of life according to those principles and concepts."
>
> (Art. 1A, Chapter 2 of the 1962 Constitution, which corresponds to clause sixth of the Preamble of the 19567 Constitution).

Law Commission.

6. Whatever may be the views of some self-opinionated persons, Pakistan was the result of a keenly felt and openly expressed decision of the Muslims of the Indo-Pakistan sub-continent to have a territory where they could live and mould their lives in accordance with Quranic injunctions. Of course, it did not exclude material gains because the Quran does believe in and, in fact, insists on making man's life on this side

PLEA FOR PRACTICAL STEPS TO IMPLEMENT QURANIC LAWS

By

SH. ABDUL HAQUE, ADVOCATE, LAHORE

Today the entire world is in a state of turmoil, and there is no peace or contentment in any society, whether oriental or occidental, whether white, brown or black, whether having a dictatorial or democratic form of Government and whether rich or poor. The race for armament, which every one outwardly condemns, goes on unabated, so much so that while empty stomachs are groaning with hunger, colossal funds are being spent on the production of guns, bullets and more deadly weapons of offense including atomic bombs. The question arises is humanity doomed or is there a ray of hope?

2. Surely, God, while creating man and providing him with limitless resources and arming him with knowledge of the universe and its potentialities, could not have intended man's destruction in the manner man himself is planning and heading for. He in His grace repeatedly showed light to man through different revelations, and in the last revelation prescribed a code of life which, if followed properly, would lead to millennium. The Holy Quran, while catering for man's spiritual needs has left no aspect of life on earth without proper guidance. It prescribes rules to be followed during peace time as well as during war. One has only to study these rules and understand and follow them in order to achieve universal peace and contentment. Is it not a paradox that the very people, who profess to believe in and follow the Quran, and thereby claim to be nearest to God, should be the most backward community of the world. The reason is not far to seek. Mere verbally believing in or professing to have faith in the efficacy of a code, as of a medicine, cannot lead to the desired results. It is the manner in and the extent to which the rules are actually worked, that matters. The words of the poet which are a mere enunciation of the Quranic law, are fully demonstrated if we compare the average life of a non-Muslim Britisher with that of a Muslim in any part of the world. An average non-Muslim Britisher by acting on Quranic injunctions lives in Islam (though he does not profess or acknowledge it) in a far greater degree than any Muslim, and it can be said without any fear of contradiction that the Britisher's life is the nearest approach to the Quranic Law. Some thinkers and statesmen of the world, who had occasion to study the Quran properly, have, at times, acknowledged that real and lasting peace in the world can be secured only by enforcing the Quranic law.